نمبر ۲۵

دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ

سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت عمر

پہلا ایڈیشن	ایک ہزار	۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء
دوسرا ایڈیشن	ایک ہزار	جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

جس کتاب پر

سیّد علی شبّر حاتمی یا محمد اقبال سلیم گاہندری

کے قلمی دستخط نہیں ہوں گے وہ مسروقہ سمجھی جائے گی

دستخط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سر جان میلکم کے بقول دولت آصفیہ پوری برٹش انڈین امپائر کا مرکز ثقل ہے سلطنت کے اندر ایک سلطنت جو تقریباً ۱۳ ملین انسانوں پر حکمراں ہو جس کے حدود کی وسعت یورپ کی جلیل القدر سلطنتوں کے برابر ہو جس کو اپنی رعایا پر کامل حاکمیت مطلقہ حاصل ہو ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کی اہمیت کو آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جاسکے ایک ایسی طاقتور سلطنت نے کس طرح برطانوی حمایت (Protection) کو قبول کرلیا اور اپنی خارجی آزادی اور فوجی استقلال کو اپنے مساوی الدرجہ بلکہ ابتداً باجگذار حلیف کے سپرد کردینے پر راضی ہوگئی ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح ڈیڑھ صدی سے زیادہ کے حلیفانہ تعلقات میں دونوں سلطنتوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے ہیں ؟ اور دونوں نے ایک دوسرے کی دوستی کا حق کیونکر ادا کیا ہے ؟ یہ بھی اہم اور ضروری سوالات ہیں۔ جہاں تک دولت آصفیہ کا تعلق ہے، تاریخ پر اس کی دوستانہ وفاداری کے واقعات نمایاں موجود ہیں میسور کی لڑائیوں سے لیکر آج تک سلطنت انگلشیہ پر کوئی ایسا نازک موقع نہیں آیا جسمیں آصفجاہی تلوار اور روپیہ نے اس کی مدد نہ کی ہو۔ اسکا اعتراف خود برطانی مدبرین نے

بھی ہمیشہ کھلے دل سے کیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں سلطنت برطانیہ نے اپنے
یار وفادار کی دوستی کا کیا بدلہ دیا؟ اس کا جواب اکثر سکوت سے دیا گیا ہے۔
تاریخ اپنے سینہ میں معلومات کا ایک وافر ذخیرہ رکھتی ہے مگر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی
دکن کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلو خاص طور پر دلچسپ ہے۔ میں ایک عرصہ
سے ارادہ کر رہا تھا کہ اس پر ایک مفصل کتاب لکھوں۔ چنانچہ اس کیلئے کافی
مواد فراہم کر لیا تھا لیکن حالات نے اس ارادہ کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی
اب ایک خاص موقع پر اخبار "الجمعیۃ" کے لئے اس موضوع پر ایک مختصر مضمون
لکھنے بیٹھا تو تمام پچھلی معلومات کا ہجوم ہو گیا اور اجمال و اختصار کی انتہائی
کوشش کرنے کے باوجود اس بحث و بیان کسی طرح سمٹ نہ سکا۔ آخر مجبوراً
اس مضمون کو چھوٹے سے رسالہ کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ اگر حالات نے
مساعدت کی تو انشاء اللہ یہی رسالہ ایک کتاب کی صورت اختیار کر لے گا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء

گزارش

۱۹۲۸ء کا زمانہ ہے، لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند اگرچہ اپنا دور فرمان روائی ختم کر کے ہندوستان سے واپس تشریف لے جا چکے ہیں۔ ان کے تیر اقتدار کے زخمی کراچی کے مشہور قیدی قفس کراچی سے باہر قید خانہ ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں۔ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے مابین اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ مابہ الاختلاف بنا ہوا ہے اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ حضرات اس کی تفصیلات سننے کے مشتاق ہیں۔

یہ تھا وہ وقت جبکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کتاب تالیف فرمائی تھی، مولانا نے اسے اس وقت خود چھپوایا تھا، کچھ دنوں کے بعد اس کے نسخے ختم ہو گئے اور لوگوں کا اشتیاق بدستور باقی رہا۔ یہاں تک کہ ۱۳ سال کی مدت مدید گزر گئی اور لوگ ایک ایسی کتاب کی تلاش میں رہے جس سے دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے دو صد سالہ تعلقات پر روشنی پڑ سکے۔

ہم نے اس قسم کی ایک کتاب کی ضرورت کا اندازہ لگانے کے بعد یہ مناسب نہ سمجھا کہ کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر تالیف کرائی جائے کیونکہ

مولانا موصوف کے قلم کی خوبی پیدا کرنا دوسروں کے لئے آسان کام نہ تھا اور دوسری طرف اہل بصیرت حضرت کا اتفاق ہے کہ اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر دوسری نہیں ہوسکتی۔

ہم نے اس کی دوبارہ اشاعت کے لئے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سے اجازت چاہی اور ہم اُن کے شکرگزار ہیں کہ مولانا موصوف نے ہمیں اس کی اجازت مرحمت فرماکر ممنون فرمایا۔

سامان طباعت خصوصاً کاغذ اس زمانہ میں جس قدر گراں بلکہ کمیاب ہوگیا ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ہمیں اس گرانی کا قصہ آپ کو سنانا منظور نہیں، لیکن ہمیں بے انتہا افسوس ہے کہ اس کتاب کو جس قدر کم قیمت پر ہم آپ کے ہاتھوں تک پہنچانا چاہتے تھے اتنی قیمت پر پہنچانا ممکن نہیں رہا پھر بھی آپ یقین فرمائیں کہ جس قدر ہمارے امکان میں تھا ہم نے اس میں کسی طرح کوتاہی نہ کی۔

ناشران
سیّد علی شبّر حاتمی
محمد اقبال سلیم گاہندری

فہرست

	صفحہ
انگریزی تعلقات ابتداء	۹
انگریزی اثر کی ابتداء	۱۲
حیدر علی کے خلاف اتحاد	۱۴
سرکار گنتور پر ناجائز تصرف	۱۵
شمالی سرکار کی واپسی کا مطالبہ اور اس کا حشر	۱۶
سرکار گنتور کی باقاعدہ تفویض	۱۷
میر عالم کی سفارت	۱۸
ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد	۱۹
انگریزوں کی بیوفائی اور فرانسیسی اثر کا دوبارہ عروج	۲۰
انگریزوں سے از سرنو اتحاد	۲۵
ٹیپو سلطان کا استیصال	۲۷
۱۸۰۰ء کا معاہدہ	۲۸
میر نظام علیخاں کا انتقال اور دور مصائب کا آغاز	۳۱

سیاسی مرتبہ میں کمی	۳۴
حیدرآباد کنٹیجنٹ کا قیام	۳۹
کنٹیجنٹ کی اصلیت	۴۶
کنٹیجنٹ کے مسرفانہ مصارف	۵۵
ملک ہضم کرنے کی تدبیریں	۶۱
کنٹیجنٹ کا قرض	۶۵
قرض کے بدلے ملک کا مطالبہ	۷۳
قرض کی اصلیت	۸۷
تفویض برار	۹۳
غدر میں نظام دکن کی وفاداری	۱۰۸
وفاداری کا صلہ	۱۱۳
سر سالار جنگ کا مطالبہ استرداد برار	۱۲۳
نواب میر محبوب علی خاں مرحوم	۱۴۴
لارڈ کرزن کا دوامی پٹہ	۱۴۷
اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں بہادر کا دور	۱۷۰
ڈیڑھ صدی کے تعلقات پر ایک نظر	۱۹۴
معاہدہ برار ۱۹۳۶ء	۲۰۰

انگریزی تعلقات کی ابتدأ

سلطنت آصفیہ سے انگریزی تعلقات کی ابتداء حضرت مغفرت مآب آصفجاہ اول ہی کے عہد میں ہو چکی تھی۔ اگرچہ وہ تعلقات دوستوں کے سے نہ تھے بلکہ ایک فریادی اور ایک فریاد رس کے سے تھے۔ اول اول انگریز اپنی تجارت کی حفاظت اور ترقی کے لئے اس سلطنت کے ماتحت عہدہ داروں سے ملکر کام لے لیا کرتے تھے۔ مگر جب ۱۷۴۶ء میں فرانسیسیوں نے انگریزوں سے مدراس چھین لیا اور کرناٹک کے آصفجاہی گورنر انورالدین خاں نے انگریزوں کی مدد نہ کی تو فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے گورنر نے نواب آصفجاہ سے فریاد کی۔ نواب نے اس فریاد کو توجہ کیسا تھ سنا اور انورالدین خاں کو حکم دیا کہ فرانسیسیوں نے انگریزوں سے جو کچھ چھین لیا ہے وہ انگریزوں کو واپس دلوا دیں۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد نواب آصفجاہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ ان کے دوسرے لڑکے ناصر جنگ مسند نشیں ہوئے۔ مگر مظفر جنگ نے (جو نواب آصفجاہ کے نواسے تھے) ان کے حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ایک دوسرے

مدعی حسین دوست خاں عرف چندا صاحب سے جو ارکاٹ کی حکومت حاصل کرنا چاہتا تھا، اتحاد کر کے ناصر جنگ کو بیدخل کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ پانڈیچری میں ڈوپلے جیسا داہیہ سیاست فرانسیسی عملداری کا حاکم اعلیٰ تھا اس نے دکن میں اپنے اثر کو بڑھانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان دونوں مدعیوں کی حمایت کیلئے مستعد ہوگیا۔ انگریز مورخین کا بیان ہے کہ مظفر جنگ کی مدد پر فرانسیسی فوج کو دیکھکر ناصر جنگ کی مدد کیلئے انگریز کھڑے ہوگئے۔ لیکن اس زمانہ میں انگریزوں کی کوئی ایسی طاقت نہ تھی کہ صوبیدار دکن ان کی مدد کا طالب ہوتا۔ یا ان کی مدد کو خاطر میں لاتا۔ ممکن ہے کہ ایک آدھ انگریز پلٹن نواب کے ساتھ ہوگئی ہو۔ مگر دکن کے مورخین نے ان کو اتنی بھی اہمیت نہ دی کہ ان کا ذکر بھی کرتے۔

بہرحال ناصر جنگ اور مظفر جنگ کا مقابلہ ہوا۔ مظفر جنگ قید ہوگئے۔ اور ناصر جنگ فرانسیسیوں کی تادیب کیلئے پانڈیچری بڑھے، راستہ میں فرانسیسیوں نے لشکر دکن پر شب خون مارا۔ ہنگامۂ اضطراب میں کرنول کے نمک حرام افغانوں نے ناصر جنگ کو شہید کر دیا اور اس طرح مظفر جنگ دکن کے فرمانروا ہوگئے۔ مظفر جنگ کی اس کامیابی نے افغانوں اور فرانسیسیوں کا اثر دربار دکن میں بہت بڑھا دیا لیکن ان دونوں قوموں میں خود باہم رقابت پیدا ہوگئی۔ فرانسیسی عنصر کا سردار موسیو بوسی تھا اور افغانوں کا سردار ہمت بہادر خاں۔ دونوں کی فوجوں میں لڑائی ہوگئی اور اس کشمکش میں مظفر جنگ اور ہمت بہادر خاں دونوں مارے گئے۔

فرانسیسی اثر کا زوال

اس کے بعد نواب آصفجاہ کے تیسرے بیٹے صلابت جنگ مسند آرائے سلطنت ہوئے

بوسی (Bussy) اور اس کی فرانسیسی فوج کا اثر اس وقت حیدرآباد میں پورے عروج پر تھا۔ بوسی کو سیف الدولہ عمدۃ الملک غضنفر جنگ بہادر کا خطاب ہفت ہزاری منصب معہ علم و نقارہ و ماہی مراتب دیا گیا تھا۔ اور صلابت جنگ کی سفارش پر شاہ دہلی کی جانب سے اس کو خلعت و سر پیچ معہ فیل خاصہ مرحمت ہوا تھا اسکی فوج کی معاش کے لئے سرکارات سیکاکول راجبندری مصطفیٰ نگر اور مرتضیٰ نگر (گنتور) بطور جاگیر دیئے گئے تھے۔ اگر وہ دانائی و فرزانگی سے کام لیتا تو صوبہ دار دکن کی تائید فرانسیسیوں کے حق میں حاصل کر لیتا۔ اور شاید ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ لیکن اس نے اپنی کوتاہ فہمی سے یہ سمجھا کہ یہی وقت دکن پر قبضہ جمانے کے لئے موزوں ہے چنانچہ اس نے سلطنت کے معاملات میں مداخلت شروع کی اس کے دیوان رمی خاں نے جسے حیدر جنگ کا خطاب دیا گیا تھا خود مدار المہام سلطنت نواب صمصام الدولہ کے ساتھ مساوات کا دم بھرنا شروع کیا اور ان دونوں نے اتنی سرکشی اختیار کی کہ آخر صلابت جنگ اور صمصام الدولہ ان سے برگشتہ خاطر ہو گئے اور انہیں خدمت سے برطرف کر دیا۔ اس برطرفی سے غضبناک ہو کر انہوں نے حیدرآباد میں فتنۂ عظیم برپا کر دیا۔ چار محل۔ چار مینار۔ اور حیدر محل پر توپیں لگا دیں۔ داد محل پر مورچہ بنایا اور شہر کو برباد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ صلابت جنگ نے یہ رنگ دیکھکر اس وقت کو نرمی سے ٹالدینا مناسب سمجھا، بوسی کو اسکی جگہ بحال کر دیا۔ و حیدر جنگ کو ورنگل، کھمم اور ملنکور کی تعلقہ داری سپرد کی لیکن اس سے ان دونوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے کچھ عرصہ بعد ایک فوجی سازش کر کے صمصام الدولہ اور میر حسین خاں کو گرفتار کر لیا اور نواب میر نظام علیخاں

ولیعہد سلطنت کو بھی قلعہ گولکنڈہ میں قید کر دینے کی تدبیر شروع کردی۔ یہ حرکت ایسی تھی کہ اس سے سلطنت کا عین وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا چنانچہ میر نظام علیخاں نے حیدر جنگ کو پکڑوا کر قتل کرا دیا۔ اور بوسی کے دوسرے ساتھی ابراہیم گارڈی کو توڑ لیا۔ اس طرح بوسی کا زور ٹوٹ گیا۔ اور اس کو حیدرآباد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا پڑا۔

انگریزی اثر کی ابتدا

یہ حیدرآباد میں پہلی مرتبہ فرانسیسی اثر کے زوال کے اسباب ہیں۔ اسی زمانہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ ہوئی اور کرنل فورڈ (Forde) اس علاقہ میں گھس آیا جو سرکار نظام سے فرانسیسی فوجوں کی معاش کے لئے دیا گیا تھا صلابت جنگ نے اپنے حدود سلطنت میں اس تجاوز بیجا کو دیکھکر انگریزوں کی تادیب کیلئے خود جانے کا قصد کیا۔ لیکن انگریز یہ سمجھتے تھے کہ صوبہ دار دکن سے بگاڑ کر انکی خیر نہیں ہے اس لئے انہوں نے خود آگے بڑھ کے صلح کی درخواست کی۔ اور ۱۷۵۹ء (۱۱۷۲ھ) میں پہلا عہدنامہ عمل میں آیا جس کی رو سے نظام دکن نے سرکار سولی پٹم سرکار نظام پٹم، اور اضلاع کونڈاویر، دواکلیر انگریزی کمپنی کو انعام میں دیئے اور وعدہ کیا کہ اپنی ریاست سے فرانسیسی فوجوں کو نکالدیں گے۔

اس عہدنامہ پر ابھی عملدرآمد نہ ہوا تھا کہ نواب میر نظام علیخاں آصفجاہ ثانی نے نواب صلابت جنگ کو معزول کر دیا اور خود عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی اس انقلاب کے بعد نواب غفراں مآب اپنی ریاست کے معاملات کی درستی میں

مشغول تھے کہ انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں قانون کے بالکل خلاف بالا بالا شاہ دہلی سے شمالی سرکاروں کی سند حاصل کرلی (حالانکہ دو سال پہلے معاہدہ پیرس میں وہ خود تسلیم کرچکے تھے کہ یہ علاقہ نظام کی ملک ہے) اور اسکے بعد جنرل کیلوڈ (Gen. Calliaud) کی قیادت میں ایک فوج بھی بھیجدی تاکہ اس علاقہ پر قبضہ کرلے۔ یہ قانون بین الملل کی ایک کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔ اس سے نارض ہوکر نواب کرناٹک پر دباؤ ڈالا جہاں انگریزوں کے اغوا سے نواب محمد علیخاں (ابن نواب انورالدین خاں) خود مختار ہوگیا تھا۔ انگریزوں نے پہلے تو کرنل کیمبل کے زیر قیادت مزاحمت کی مگر بعد میں نواب کے بگڑے ہوئے تیور دیکھکر خائف ہوگئے۔ اتنے بڑے فرمانروا سے لڑنے کی ان میں جراءت نہ تھی۔ دوسرے حیدر علی کے ساتھ نظام دکن سے بھی بگاڑ لینا ان کے حق میں سخت خطرناک تھا اس لئے فورٹ سینٹ جارج کی پریسیڈنسی سے جنرل کیلوڈ صلح کی استدعا لے کر حیدرآباد بھیجا گیا اور نومبر ۱۷۶۶ء میں اس نے سرکار نظام کے ساتھ ایک جدید عہدنامہ مرتب کیا۔ اس عہدنامہ کی روسے انگریزوں نے شمالی سرکاروں کی سند ان کے قانونی مالک سے حاصل کی اور راجبندری سیکاکول ایلورا اور مصطفیٰ نگر کی سرکاروں کے عوض ۷ لاکھ روپیہ سالانہ خراج دینا قبول کیا اور مرتضیٰ نگر کے متعلق یہ طے ہوا کہ نواب بسالت جنگ (نواب آصفجاہ ثانی کے چھوٹے بھائی) کی زندگی میں یہ علاقہ ان کے زیر تصرف رہیگا بعد میں وہ بھی انگریزوں کو مل جائے گا اور اس کے عوض انگریزی کمپنی ۲ لاکھ سالانہ خراج سرکار نظام کو دے گی۔ اس کے مقابلہ میں انگریزوں نے عہد کیا کہ وہ ہر ضرورت کے موقع پر سرکار نظام کی مدد کے لئے ایک فوج مستعد رکھیں گے

اس فوجی امداد کا خرچ اگر شمالی سرکاروں کے[4] خراج سے کم ہوگا تو اسے رقم خراج میں سے وضع کر کے باقی ماندہ رقم سرکار میں داخل کی جائے گی۔ اور اگر خراج سے زیادہ ہوگا تو زائد رقم کی ذمہ دار خود کمپنی ہوگی۔ یہ فوجی خدمات کا پہلا دام تھا جس میں نظام دکن کو پھانسا گیا۔ بعد میں اس نے جو جو شکلیں اختیار کی ہیں انکا ذکر آگے آتا ہے۔

حیدر علی کے خلاف اتحاد

مذکورہ عہدنامہ کے مطابق نظام دکن کی خدمت کے لئے ایک مستقل فوج حیدر آباد میں رکھنا انگریزوں کا فرض تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب حیدر علی کی قوت سے انگریزی مقبوضات کو خطرہ لاحق ہوا تو یہ فوج اگست ۱۷۶۷ء میں حیدر آباد سے واپس بلالی گئی۔ اور اسے انگریزی مقبوضات کی حفاظت پر لگا دیا۔ نواب آصفجاہ ۱۷۶۶ء کے عہدنامہ کی پابندی کرتے ہوئے حیدر علیخاں کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنے پر مستعد ہو چکے تھے مگر ان کی اس بدعہدی کو دیکھکر ناراض ہو گئے اور ان کی مدد سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر رکن الدولہ مدار المہام نے حیدر علی کی سفارش کی۔ خود حیدر علی نواب کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا اور جب نواب بازدید کیلئے اس کے ہاں گئے تو جلوخانے تک آکر آداب و مجرا بجالایا ۱۵ ہزار روپے نقد اور دو ہزار پتلیاں سونے کی نذر میں پیش کیں۔ چبوترۂ زر پر بیٹھا کر بٹھایا، جواہر کے خوان، پارچہ و پوشاک، دو عدد فلادۂ فیل اور دو تین توپیں نذر گذرانیں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ اگر سلطنت دکن اور ریاست میسور کا دائمی اتحاد ہو جاتا تو کم از کم جنوبی ہند پر اسلامی سلطنت از سر نو مستحکم ہو جاتی مگر مشیت الٰہی کو کچھ اور منظور تھا نوا۔

آصفجاہ کی واپسی پر دربار کا رنگ پھر بدلا۔ نواب والاجاہ محمد علیخاں والی کرناٹک نے جو انگریزوں کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ چکا تھا، حاضر ہو کر نہ معلوم کیا پٹی پڑھائی کہ نواب غفراں آب کا مزاج پھر حیدر علی سے منحرف اور انگریزوں کی جانب منعطف ہو گیا۔ اس کے بعد ہی رکن الدولہ مدراس بھیجے گئے اور وہاں فروری ۱۷۶۸ء میں ایک تہنامہ مرتب ہوا جسکی رو سے نواب آصفجاہ نے کرناٹک کی دیوانی سات لاکھ روپئے سالانہ خراج کے عوض انگریزوں کے سپرد کی۔ نواب کرناٹک کے معاملات میں مداخلت سے دست برداری لکھی۔ اور انگریزوں نے عہد کیا کہ وہ سپاہیوں کی دو پلٹنیں گولندازوں کی کافی تعداد بمیعت، نواب کی خدمت میں دیں گے جس کا خرچ نواب کو دینا ہوگا۔ مگر یہ فوج ایسی طاقتوں کے ساتھ استعمال نہ کی جائیگی جن سے انگریزی کمپنی کی دوستی ہو۔

یہ اسی سبسڈیری الائنس (Subsidiary Alliance) کی بنیاد تھی جس نے بعد میں ترقی کر کے ریاست کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا۔ افسوس! اس وقت کوئی ایسا صاحب نظر سیاست داں موجود نہ تھا جو اس حقیقت کو سمجھتا کہ سلطنت کا استحکام اس کی اپنی طاقت پر منحصر ہوتا ہے نہ کہ کسی حلیف کی مدد و اعانت پر۔

سرکار گنتور پر ناجائز تصرف

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۷۶۶ء میں سرکار گنتور کے متعلق کمپنی سے یہ عہد ہوا تھا کہ بسالت جنگ کی زندگی تک یہ علاقہ ان کی جاگیر میں رہے گا۔ اس کے بعد پھر کمپنی کو مل جائے گا۔ لیکن انگریز ملک گیری کی ہوس میں بے چین تو رہتے تھے۔

بسالت جنگ کے مرنے تک صبر کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا اور انہوں نے شہزادہ کو حیدر علی کے خطرہ سے ڈرا کر ۱۷۷۹ء میں اس سے سرکار گنتور کا قبضہ حاصل کر لیا۔ اور اسے نواب کرناٹک کو دس سال کے پٹہ پر بھی دے دیا۔ یہ نہ صرف ایک صریح بدعہدی تھی بلکہ ایک حلیف کی رعایا سے ناجائز سازباز کرنا اور اس کے ملک پر بیجا تصرف کرنا تھا۔ جس کو نظام ایک معاندانہ فعل قرار دینے میں حق بجانب تھے۔ انہوں نے اس حرکت پر سختی کے ساتھ احتجاج کیا اور احتجاج کو موثر بنانے کے لئے فرانسیسی فوج کو پھر ملازم رکھ لیا۔ اس معاملہ کی خبر کلکتہ پہونچی تو سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ گورنر نے نومبر ۱۷۷۹ء میں نواب کو ایک طویل معذرت نامہ لکھا خود کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اس معاملہ کی تحقیقات کی اور آخر نواب کو خوش کرنے کے لئے نہ صرف سرکار گنتور واپس کی گئی بلکہ سرویلیم رمبالڈ (Sir W. Rumbald) گورنر مدراس کو اسکی کونسل کے ارکان سمیت برطرف کر دیا گیا۔

شمالی سرکار کی واپسی کا مطالبہ اور اس کا حشر

بسالت جنگ کے انتقال کے بعد ۱۷۸۴ء میں کمپنی کی طرف سے مسٹر جانسن کو وکیل بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا۔ تاکہ سرکار گنتور کی حوالگی کا مطالبہ کرے۔ اس زمانہ میں نواب کو اپنی پہلی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور انہوں نے ملک دیگر اجنبی طاقتوں سے فوج رکھوانے کے انجام کو سمجھ لیا تھا۔ اس لئے انگریزی وکیل کے سامنے انہوں نے تجویز پیش کی کہ کمپنی شمالی سرکاروں کو واپس کر دے اور اس کے عوض سرکار نظام نہ صرف پیشکش کا بقایا معاف کر دیگی بلکہ ایک کروڑ روپیہ

نقد بھی کمپنی کو دے گی۔ اس کے ساتھ نواب غفراں مآب نے کرناٹک کی واپسی کے لئے بھی ایسی ہی تجاویز پیش کی تھیں۔ مسٹر جانسن نے ان تجاویز کو پسند کیا اور سپریم گورنمنٹ کو ان کی منظوری کے لئے لکھا لیکن وہاں سے سختی کے ساتھ انہیں رد کر دیا گیا اور اس قصور میں کہ غریب جانسن نے ان تجاویز کو سنا بھی کیوں؟ اسے منصب وکالت سے برطرف کر دیا گیا۔[۱]

سرکار گنتور کی باقاعدہ تفویض

۱۷۸۸ء میں لارڈ کارنوالس نے کیپٹن کنوے (Kennaway) کو پہلی مرتبہ ریزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا اور اسے شمشیر جنگ کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ اس مرتبہ سرکار گنتور کی تفویض کا مطالبہ صرف زبانی ہی نہیں پیش کیا گیا بلکہ سلطنت آصفیہ کی سرحدوں پر فوج کا اجتماع بھی کیا گیا تاکہ اگر نظام کچھ پس و پیش بھی کریں تو انہیں فوجی خدمات کے عوض ملک دینے کی سزا دی جائے۔ اب نظام کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ خود اپنا ملک دیکر فوج رکھوانے کا کیا انجام ہوتا ہے مگر اس کا تدارک اب ان کے بس کا نہ تھا۔ مجبوراً انہیں قدرتی نتائج

Our Faithful Ally the Nizam P. 36

۲ھ۔ اس مقام پر حکومت نظام نے بعد میں ۲ لاکھ کے صرفہ سے ایک عظیم الشان کوٹھی انگریزی کلا کے قیام کیلئے بنوا دی مگر اس مہمان نوازی کے جرم میں ریاست کو یہ سزا دی گئی کہ نہ صرف اس عمارت پر بلکہ اسکے اردگرد شہر حیدرآباد کے ایک اچھے خاصے حصہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا چنانچہ حیدرآباد میں ریذیڈنسی کا ایک پورا محلہ انگریزی تصرف میں ہے (تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۶۹۳)

3 Our Faithful Ally P. 37

کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔ اور شمالی سرکار[15] کی واپسی کے خیال سے ہاتھ دھو کر اپنے ملک کے ایک اور حصہ کی علیحدگی گوارا کرنی پڑی۔

اب تک کمپنی نے اس ملک کا پیشکش بھی ادا نہیں کیا تھا جو ۱۷۶۶ء اور ۱۷۶۸ء کے معاہدوں کی روسے اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ رقم ۶۷۴۹۳۳۳ روپئے تک پہونچ چکی تھی۔ نظام نے اس کا مطالبہ کیا۔ لیکن کمپنی نے صرف ۹۱۶۶۶۵ روپئے پیش کئے اور ۵۸۳۲۶۶۷ روپئے اس بہانہ سے کاٹ لئے کہ یہ بسالت جنگ کے انتقال ستمبر ۱۷۸۲ء سے لیکر سرکار گنتور کی تفویض ستمبر ۱۷۸۸ء تک کا ہرجانہ ہے[16]۔

میر عالم کی سفارت

۱۷۸۸ء میں بعض معاملات کے تصفیہ کے لئے سرکار نظام کی طرف سے ایک ہیئت سفرا کلکتہ بھیجی گئی۔ جو عاقل الدولہ، نظام یار جنگ، میر عبدالعزیز خاں، غلام نبی خاں اور میرزا ابوتراب خاں سے مرکب تھی اور میر عالم اس کے صدر تھے اس سفارت کی گفت وشنید سے ایک اور تہنا مہ عمل میں آیا جو لارڈ کارنوالس کے ایک خط کی صورت میں ہے اس میں لارڈ کارنوالس نے اس امر کی تصریح کی کہ جو فوج نواب آصفجاہ کے خرچ پر رکھی گئی ہے وہ ہر ایسے موقع پر ان کی خدمت کے لئے حاضر رہے گی جبکہ وہ اسے طلب کریں، لیکن اسے پیشوا، رگھوجی بھونسلہ مادھوراؤ سندھیا، نواب ارکاٹ اور راجایان چینا و روٹرا ونکور کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔

Our Faithful Ally P. 37

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ فوج صرف ٹیپو سلطان کے مقابلے کے لئے رکھی گئی تھی۔ کیونکہ نظام کے تمام ہمسایہ رئیسوں اور نوابوں کو مستثنیٰ کرنیکے بعد صرف ایک ٹیپو سلطان ہی باقی رہ گیا تھا۔

اس خط میں یہ بھی تصریح کردی گئی تھی کہ آئندہ شمالی سرکاروں کے مسئلہ کو چھیڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے یعنی یہ علاقہ جو سلطنت دکن سے علیحدہ کیا جاچکا ہے اب کسی حال میں اصل مالک کو نہ ملے گا۔

ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ٹیپو سلطان کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی اور انگریز سمجھتے تھے کہ اگر اس اولوالعزم سپاہی کو دس، پانچ برس کی بھی مہلت مل گئی تو پھر کم از کم جنوبی ہند میں ان کا قدم ٹکنا محال ہوجائے گا۔ اس لئے انہوں نے یہ عزم کیا کہ اس سرچشمہ کو طوفان بننے سے پہلے ہی بند کردینا چاہیئے لیکن ٹیپو سلطان تنہا انگریزوں کے بس کا نہ تھا نظام اور مرہٹوں کی امداد کے بغیر اس کا زور توڑنا ناممکن تھا اور کم از کم نظام کو ان کے ایک ہم مذہب رئیس کے مقابلے میں شرکت جنگ پر آمادہ کرنا مشکل تھا لہٰذا اس کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی کہ ایک طرف ٹیپو کی اولوالعزمیوں کو خود نظام کے لئے خطرناک ظاہر کیا گیا دوسری طرف ان کے سامنے یہ فائدے کی صورت پیش کی گئی کہ اگر ٹیپو کو مغلوب کرلیا گیا تو ملک اتحادیوں پر برابر تقسیم ہوجائے گا۔ یہ تدبیر کارگر ہوگئی جولائی ۱۷۹۰ء میں نواب آصف جاہ، پنڈت پردہان پیشوا، اور کمپنی بہادر کے

درمیان دفاعی و ہجومی اتحاد کا معاہدہ ہو گیا اور اس کے بعد ہی تینوں قوتوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔

اس جنگ میں نظام الملک کی اعانت کے لئے کمپنی نے وہ فوج بھیجی جو خود نظام کے خرچ پر رکھی گئی تھی لیکن یہ فوج اس قدر ناقص و ناکارہ تھی کہ اس سے جنگ میں کوئی کام نہ لیا جا سکتا تھا۔ خود رزیڈنٹ (کیپٹن کنوے) نے اعتراف کیا کہ وہ نہایت غیر فوجی اور غیر مکمل حالت میں تھی۔ نظام نے جب اس کی سختی کے ساتھ شکایت کی تو لارڈ کارنوالس نے معذرت نامہ لکھا جس میں اس نے صاف طور پر تسلیم کیا کہ

"ہز ہائنس کمپنی سے اس امر کی شکایت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ سرکار کمپنی ان کی ایسی اعانت کرنے سے قاصر رہے جس کے وہ معاہدہ اور پیہم مواعید کی رو سے مستحق تھے۔"[۱]

بہرحال نظام نے وفائے عہد کا حق ادا کیا اور جنگ میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیپو کو شکست ہوئی اسے آدھا ملک اتحادیوں کے سپرد کرنا پڑا اور اس مفتوحہ علاقہ میں سے نظام کے حصہ میں ۱۳۱۶۶۶۶ ھن کا ملک آیا۔

انگریزوں کی بیوفائی اور فرانسیسی اثر کا دوبارہ عروج

جنگ میسور کے خاتمہ کے بعد ہی دولت آصفیہ کے ایک ماتحت رئیس

[۱] Memoirs and correspondence of Frazer P. 470

جاگیردار کرنول کی تابعیت کے مسئلہ میں نظام اور ٹیپو سلطان کے درمیان نزاع برپا ہوئی جسے طے کرنے کے لئے نظام نے اس فوج کو طلب کیا جو خود انہیں کے روپے سے رکھی گئی تھی لیکن کمپنی نے اس کے دینے میں انتہا درجہ کی ٹال مٹول کی اور محض فوجی خدمت سے بچنے کے لئے یہاں تک کیا کہ کرنول پر نظام کے قانونی حقوق تک تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔[1]

اس کے بعد نظام کو ایک ایسے علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کی ضرورت پیش آئی جو معاہدہ سرنگا پٹن کی رو سے ان کے حصے میں آیا تھا۔ اس کام کے لئے انہوں نے پھر کمپنی سے اپنی فوج طلب کی مگر پھر اسے بھیجنے سے انکار کردیا گیا۔

۱۷۹۴ء میں کرنول کے نئے رئیس الف خاں نے کھلم کھلا نظام کی اطاعت سے انحراف کر کے ٹیپو سلطان کی اطاعت اختیار کرلی نظام نے چاہا کہ کمپنی کی فوج بھیجکر اسے راہ راست پر لائیں مگر اس مرتبہ بھی فوج دینے سے صاف انکار کردیا گیا۔

سرجان شور (گورنر جنرل) نے صاف الفاظ میں لکھدیا کہ:۔

"رزیڈنٹ کو نظام پر یہ امر واضح کردینے کے ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے کہ کمپنی کی فوج کے ان کی خدمت میں حاضر رہنے کو ہماری باہمی دوستی کی ایک علامت سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ اسے نظام کی سرکش رعایا سے خراج وصول کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے۔"[2]

---

[1] Our Faithful Ally. The Nizam P. 55

[2] ایضاً صفحہ ۷۲۔۷۴

ان اہم واقعات سے نظام پر اچھی طرح روشن ہو گیا کہ کمپنی کی فوج ان کے کسی کام کی نہیں ہے بلکہ کمپنی نے اسے ان کے خرچ پر اپنی خدمت کے لئے رکھا ہے اسی زمانہ میں مرہٹوں سے نظام کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے مرہٹوں کی جانب سے چوتھ کے بقایا کا مطالبہ سخت تھا۔ اور نظام کو ہر وقت مرہٹہ فوج کے حملہ کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ نظام نے کمپنی کے رویہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی طرح بھی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور اپنے وفادار حلیف کے لئے حد سے حد یہی کر سکتی ہے کہ مصالحت کی کوشش کر دے۔ دوسری طرف جب مرہٹوں کی طاقت کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک فرانسیسی افسر موسیو دِ بوئینے (M. Deboigne) کی قیادت میں ایک زبردست باضابطہ فوج قائم کر لی ہے اور ان حالات کو دیکھکر نظام نے قطعی فیصلہ کیا کہ کمپنی کی ناکارہ فوج سے اپنا پیچھا چھڑائیں اور اپنی ایک مستقل باضابطہ فوج مرتب کریں چنانچہ اس غرض کے لئے ایک فرنچ افسر موسیو ریموں (M. Raymond) کو جو موسی رحمو کے نام سے مشہور ہے ملازم رکھا گیا اور اس کے ماتحت دیسی اور یورپین فوجوں کے دستے مرتب کئے گئے اس کے علاوہ چند اور امریکن فرنچ اور انگریز افسروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔

ان افواج کی ترتیب کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ۱۷۹۵ء میں مرہٹوں سے جنگ چھڑ گئی۔ مقام کھرڈلہ پر سخت معرکہ ہوا جس میں نظام کو شکست ہوئی اور انہیں اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ ۳۶ لاکھ کا ملک اور ۲ کروڑ روپیہ نقد مرہٹوں کو دینگے اور ارسطو جاہ کو یرغمال کے طور پر ان کے سپرد کر دینگے۔ یہ محض اس کا نتیجہ تھا کہ

نظام نے کمپنی کی دوستی پر بھروسہ کیا۔ اور پہلے ہی خود اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرنے کی کوشش نہ کی۔

جنگ کھڑلہ سے واپس ہوتے ہی نظام نے انگریزی پلٹنوں کی برطرفی کا حکم دیدیا اور موسی رمو کی جمعیت کو ترقی دینی شروع کی یہاں تک کہ ۱۵۰۰۰ ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی اور اس کے لئے ۱۳۰۰۰۰ روپیہ ماہانہ مقرر کیا گیا۔ اس کیساتھ حیدرآباد میں ایک جنگی کارخانہ بھی قائم کیا گیا جس میں ہر قسم کا بہترین سامان جنگ تیار ہوتا تھا۔ ان واقعات سے بہت ممکن تھا کہ حالات ایک نیا رخ بدل لیتے اور تاریخ کوئی دوسری شکل اختیار کرتی لیکن اس زمانہ میں ایک زبردست سازش کھڑی ہوگئی۔ شاہزادہ عالیجاہ کو باپ کے خلاف بغاوت پر ابھارا گیا۔ بیدر کے زمیندار اس کے ساتھ مل گئے۔ مرہٹوں کی امداد بھی اس کو حاصل ہوگئی اور نظام کا تخت خود ان کے اپنے جگرگوشہ کے ہاتھوں خطرہ میں پڑگیا۔ ایسی حالت میں نظام دوبارہ کمپنی سے امداد طلب کرنے پر مجبور ہوگئے اور وہی فوجیں جنکی برطرفی کا حکم دیا جاچکا تھا مجبوراً پھر مانگ لی گئیں۔ تاہم ابھی تک فرانسیسی اثر پورے زور پر تھا۔ ولیعہد سلطنت نواب سکندرجاہ کی موسی رمو سے بیحد موافقت تھی۔ یہاں تک کہ وہ رمو کے سر کی قسم کھایا کرتے تھے۔ دربار میں اس کے اثر کا یہ عالم تھا کہ ہر پارٹی اس کی تائید حاصل کرنے کی خواہشمند تھی اور اس کی مخالفت کی کسی کو جرات نہ ہوتی تھی باوجودیکہ دربار کے بڑے بڑے امراء شاہزادہ فریدوں جاہ کو ولیعہد بنانے کی کوشش کر رہے تھے مگر چونکہ رمو شاہزادہ سکندرجاہ کا مؤید تھا اسلئے

سب و م بخود تھے۔ ۱۷۹۶ء میں جب نواب غفراں مآب سخت بیمار تھے تو ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل لکھا تھا کہ

بلاشک و شبہ یہ فرانسیسی اس وقت ایسی پوزیشن میں ہے کہ نظام کا انتقال ہو جانے کی صورت میں وہ جس کو چاہے گا مسند نشیں کرا دیگا۔ ؎۱

اس زمانہ میں ٹیپو سلطان نے نواب آصف جاہ کو انگریزوں کے خلاف ایک جہاد عام میں شرکت کی دعوت دی اور ایک طویل خط لکھا جس میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیکر نواب کو اس فریضۂ دینی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مل کر ان ممالک کو کفار سے واپس لیں جو پہلے دارالاسلام رہ چکے ہیں۔ ایک طرف ان باتوں کا اور دوسری طرف انگریزوں کی سابق بیوفائوں کا نظام پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے انگریزی رزیڈنٹ کیپٹن کرک پیٹرک کو حکم دیدیا کہ وہ کمپنی کی فوجوں کو واپس بھیجدے، قریب تھا کہ انگریزی کمپنی سے نظام کے تعلقات منقطع ہو جاتے۔ مگر عین وقت پر سیاسی فریب کاری نے کمپنی بہادر کی دستگیری کی۔ رزیڈنٹ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ نظام اور ٹیپو سلطان کے مابین کرنول کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ؎۲ میر عالم نے اس کام میں رزیڈنٹ کی امداد کی۔ اور بڑے وثوق کے ساتھ نظام کو یقین دلایا کہ ٹیپو نے

؎۱ Our Faithful Ally P. 459

؎۲ ایضاً صفحہ ۲۱۲-۲۱۳

کرنول پر قبضہ کر لینے کا پورا سامان کر لیا ہے۔ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی اسی زمانہ میں ارسطو جاہ بھی پونا سے چھوٹ کر آگئے اور انہوں نے بھی اپنی قوت اسی جماعت کی تائید میں شامل کردی جو ٹیپو سلطان کے ساتھ نظام کے اتحاد کی مخالف تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ٹیپو کے وکلا ناکام و نامراد واپس گئے اور انگریزی فوجوں کی واپسی کا حکم واپس لے لیا گیا۔

انگریزوں سے ازسرنو اتحاد

اس موقع پر قدرت نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مارچ ۱۷۹۸ء میں موسیٰ رحمو مر گیا اور اس کی جگہ ایم پیرول (Meperron) مقرر ہوا جو اپنے پیشرو کی سی قابلیتیں نہ رکھتا تھا۔ ان واقعات نے دفعتہً حالات کے رخ کو بدل دیا اور ہمیشہ کے لئے بدلدیا۔ نظام کی مرہٹوں سے پہلے ہی دشمنی تھی۔ اب انگریزوں کی چالاکی سے ٹیپو سلطان کے ساتھ بھی ٹھن گئی اتنے دشمنوں میں تنہا اپنی سلطنت کا وجود قائم رکھنا ان کیلئے مشکل تھا اس لئے انہوں نے دوبارہ انہی بیوفا دوستوں کی طرف رجوع کیا جو محض اپنے فائدے کے لئے دوستی کرنے کے عادی تھے۔ انگریز ٹیپو کا سر کچلنے اور اس کے بعد مرہٹوں کا استیصال کرنے کے لئے اسکے دل سے آرزومند تھے۔ دکن میں انکی ساری سیاست کا محور یہی ایک نقطہ تھا کہ نظام سب طرف سے کٹ کر صرف ہماری ہی دوستی پر بھروسہ کرنے لگیں جیسا کہ

لارڈ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول کو لکھا تھا کہ اس زمانہ میں انگریزی قوم کے لئے بہترین پالیسی یہی تھی کہ نظام کے وزن کو ہندوستانی طاقتوں کے پلڑے میں شامل ہونے سے روک دیں چنانچہ ٹیپو کی طرف سے نواب کے انحراف طبع کو دیکھتے ہی انگریزوں نے دوستانہ اتحاد کی درخواست پھر پیش کی اور ستمبر ۱۷۹۸ء میں ایک جدید تہنامہ رقم پذیر ہوا جس کی روسے انگریزوں کی جمعیت تعلبندی (Subsidiary Force) کو مستقل کر دیا گیا اسکی تعداد بڑھاکر چھ پلٹنوں تک کردی گئی۔ اس کیلئے سرکار نظام کے خزانہ پر ۲۴۱۷۱۰۰ روپیہ سالانہ کا بار ڈالا گیا۔ اور اس کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ نظام کی ذات اور انکی سلطنت کی حفاظت کرے اور ریاست کے باغی سرداروں کی سرکوبی کرے۔ مگر یہ شرط لگادی گئی کہ چھوٹے چھوٹے کام اس سے نہ لئے جائیں گے۔ اور نہ مالگذاری وصول کرنے کیلئے سبندی کا کام اس سے لیا جائے گا۔ اور نہ کمپنی کے دوستوں کے خلاف اس کو استعمال کیا جائے گا اس کے عوض حکومت نظام نے وعدہ کیا کہ اس فوج کے پہنچتے ہی فرانسیسی فوجوں کو منتشر کردیگی اور آئندہ کسی فرانسیسی کو اپنے ہاں ملازم نہ رکھے گی اور نہ کسی یورپین کی خدمات کمپنی کی رضامندی کے بغیر حاصل نہ کرے گی۔

اس تہنامہ پر دستخط ہونے کے بعد ہی کمپنی کی فوجیں حیدرآباد پہنچ گئیں فرانسیسی افسروں کے ماتحت نظام کی باقاعدہ فوج کو زبردستی منتشر کیا گیا۔ اور جتنے فرانسیسی سرکار نظام کے ملازم تھے ان کو گرفتار کرکے یورپ

بھیجدیا گیا۔[1]

ٹیپو سلطان کا استیصال

۹۸-۱۷۹۷ء کا یہ معاہدہ انگریزی ڈپلومیسی کی عظیم الشان فتح تھا۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے آخری اور فیصلہ کن مقابلے کیلئے جو زبردست طیاریاں کیں تھیں انمیں اگر نظام الملک کی طاقت اسکے ساتھ شامل ہو جاتی تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا لیکن انگریزوں نے ایک طرف ان دونوں اسلامی فرمانرواؤں میں پھوٹ ڈالی دوسری طرف ۱۵ ہزار کی زبردست فوج کو جو سلطنت آصفیہ کی جنگی طاقت کا سب سے بڑا سہارا تھی ایک قطرہ خون بہائے بغیر منتشر کردیا اور تیسری طرف مملکت آصفیہ کے وسیع ذرائع ثروت و قوت کو اپنی تائید میں حاصل کرلیا جس سے جنوبی ہند میں ان کو فیصلہ کن قوت حاصل ہوگئی اور جنگی بدولت وہ مرہٹہ اور میسور کی طاقتوں کو فنا کرکے ماورائے وندھیاچل کے مالک و مختار بن گئے یہ نتائج تنہا انگریزوں کی چالاکی ہی سے حاصل نہیں ہوئے بلکہ ہندوستانیوں کی اپنی کمزوریوں نے بھی اس میں برابر کا حصہ لیا اس وقت دکن میں تین زبردست طاقتیں تھیں ایک مرہٹے اور دوسرے نظام تیسرے میسور اگر ان تینوں طاقتوں میں حسن تفاہم اور اتحاد ہوتا تو انگریزوں کے پاؤں جمنے مشکل تھے لیکن بدقسمتی سے ان تینوں میں باہم سخت رقابت تھی۔ مرہٹے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے ٹیپو سلطان اپنے مجاہدانہ خلوص کے باوجود ملک گیری کی خواہش سے خالی نہ تھا اور نظام الملک اپنے گردوپیش کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے ان دونوں ہمسایوں پر اعتماد نہ کرسکتے تھے اس سوء تفاہم اور بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو دکن کی بساط پر خود دکن کے

---

[1] Our Faithful Ally the Nizam P. 219—20

پھر لڑائی کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ پہلے نظام اور مرہٹوں کو ملا کر انہوں نے ٹیپو کا استیصال کیا پھر نظام کی مدد سے مرہٹوں کا زور توڑا اور اس کے بعد ارادہ تھا کہ نظام کی سلطنت کو بھی ہضم کر جائیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا مگر خدا کو اس دولت اسلامیہ کا بقا مقصود تھا اس لئے ساری بلا صرف برار پر ٹل گئی اور اسلام کی عظمت رفتہ کا یہ نشان اس ملک میں محفوظ رہ گیا

واقعات کے سلسلہ کو جوڑتے ہوئے اب ہم اس زمانہ پر پہنچتے ہیں جبکہ انگریزوں نے اپنی تدبیروں کا جال مکمل کرنے کے بعد اطمینان کیساتھ ٹیپو سلطان کا خاتمہ کر دیا۔ نواب آصفجاہ سے معاہدہ ہونیکے بعد ہی ۱۷۹۹ء میں میسور سے جنگ چھیڑ دیگئی ٹیپو سلطان اپنی تمام تدبیروں میں ناکام ہو چکا تھا تنہا اپنی فوجی قوت سے مقابلہ نہ کر سکا اور آخر اپنے منصوبوں کی تکمیل میں جان لڑاتے ہوئے شہید ہو گیا اس کے بعد از روئے انصاف ملک کو نظام اور کمپنی کے درمیان مساویانہ تقسیم ہونا چاہئے تھا مگر لارڈ ولزلی نے نظام کو صرف ۶۰۷۳۳۲ حصہ کا ملک دیا اور میسور کی ریاست الگ جان میسور کے قدیم خاندان کے سپرد کر دی اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ میسور کو تقسیم کرنے کی صورت میں لارڈ ولزلی کو اندیشہ تھا کہ نظام کے ہاتھ ایسے مضبوط قلعے آجائینگے جنسے برطانی سرحد ہمیشہ خطرے میں رہیگی۔

۱۸۰۰ء کا معاہدہ

اس خرخشے سے نجات پانیکے بعد کمپنی کی سیاست کا رخ مرہٹوں کی طرف پھر گیا اور اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے دوسری طرف نظام کی سلطنت میں میسور کی دو لڑائیوں سے جو افزایش ہوگئی تھی اس کا تدارک بھی ضروری تھا تیسری طرف انگریزی سلطنت کے مزید استحکام کیلئے اس امر کی ضرورت محسوس کیجا رہی تھی کہ ہندوستانی ریاستوں میں باہم کسی قسم کے تعلقات باقی نہ رہیں۔ کیونکہ ان کے آپس کے تعلقات سے

یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کبھی باہم متحد ہو کر کمپنی کی توسیع مملکت میں مزاحم ہوں ان اغراض سہ گانہ کو پیش نظر رکھکر لارڈ ولزلی نے نظام سے ایک نئے معاہدہ کیلئے گفت وشنید شروع کی اور آخر ۱۲ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ایک عہدنامہ مرتب ہوا جس نے انگریزی حکومت کے ساتھ نظام کے تعلقات کو ایک نئی بنیاد پر قائم کیا اس عہدنامہ کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) دونوں سلطنتوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کریگی تو دونوں ملکر اس کا مقابلہ کرینگی ۔ نیز برٹش گورنمنٹ نے عہد کیا کہ وہ کسی طاقت کو نظام کے ممالک محروسہ پر حملہ نہ کرنے دیگی ۔ اور خود اپنے مقبوضات کی طرح نظام کے مقبوضات کی بھی حفاظت کریگی (جنگ کھڑلہ کے موقع پر نظام اسی قسم کے اتحاد کے خواہشمند تھے ۔ مگر چونکہ اس وقت میسور کی مہم پیش نظر تھی اس لئے مرہٹوں کو خوش رکھنے کے لئے ایسا اتحاد کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا ۔

(۲) اس مدافعت کے کام میں کمپنی کی مدد کرنے کے لئے طے ہوا کہ جمعیت تعلبندی (Subsidiary Force) میں مستقل طور پر دو پلٹنوں کا اضافہ کر دیا جائے (یعنے کل ۸ ہزار فوج رکھی جائے)

(۳) اس فوج کے مصارف ادا کرنے کے لئے نظام نے وہ تمام ملک کمپنی کے سپرد کیا جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی جنگہائے میسور میں ان کے ہاتھ آیا تھا اور جسکی سالانہ آمدنی ۶۲ لاکھ روپیہ تھی ۔

(۴) کسی تیسری طاقت سے جنگ چھڑنے کی صورت میں نظام نے وعدہ کیا کہ جمعیت تعلبندی کی ۶ پلٹنوں کے علاوہ وہ خود اپنی فوج میں سے ۱۵ ہزار سپاہی معہ ساز وسامان گورنمنٹ کی مدد کے لئے بھیجیں گے ۔

(۵) نظام نے عہد کیا کہ وہ کمپنی کی اطلاع کے بغیر کسی دوسری طاقت سے کسی قسم کے تعلقات نہ رکھیں گے۔ اس کے عوض کمپنی نے عہد کیا کہ وہ نظام کی اولاد انکے اعزہ اور انکی رعایا اور ان کے ملازموں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گی جنکے حق میں نظام کے اختیارات مطلق ہوں گے۔

(۶) دوسری طاقتوں سے حکومت نظام کی نزع ہونے کی صورت میں کمپنی کی حکومت کو فیصلہ کرنے کا کامل اختیار ہوگا۔

(۷) کمپنی نے وعدہ کیا کہ اگر شوراپور اور گدوال کے زمیندار یا نظام کے دوسرے ماتحت سرداران کے جائز حقوق ادا کرنے سے احتراز کریں گے یا ان کے ممالک محروسہ غدر و فتنہ برپا کریں گے تو جرم کی حقیقت کو اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد جمعیت نعلبندی انکو نگونسار کرنے کیلئے ہزہائینس کی افواج کے ساتھ شرکت عملی کرے گی[۱]

اس معاہدہ کی اکثر شرائط ایسی تھیں جن کو انگریزی حکومت نظام سے تسلیم کرانے کے لئے عرصہ سے بے چین ہو رہی تھی خصوصاً پانچویں اور چھٹی شرطکی انہیں خاص ضرورت تھی تاکہ نظام برٹش سلطنت کی حمایت (Protection) قبول کرکے اپنی خارجی آزادی سے دست بردار ہوجائیں۔ نومبر ۱۷۹۹ء میں جب نواب غفران مآب میر نظام علیخاں سخت بیمار تھے اور زندگی کا بھروسہ نہ رہا تھا تو نواب سکندر جاہ کے سامنے یہی شرائط پیش کی گئی تھیں اور ان سے صاف کہدیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ انکی مسند نشینی کی تائید صرف اس صورت میں کرسکتی ہے کہ وہ ان شرائط کو قبول کرلیں[۲]

---

[۱] Aitchisons Treaties and Engagements Vol. ix p.p. 67—73

[۲] Wellington's Despatches May 19, 1803

میر نظام علی خاں کا انتقال اور دور مصائب کا آغاز

اگست ۱۸۰۳ء میں نواب میر نظام علیخاں کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ نواب سکندر جاہ بہادر مسند نشین ہوئے غفراں مآب کی آنکھ بند ہوتے ہی انگریزوں نے مدار المہام سلطنت ارسطو جاہ سے ساز باز کرکے نواب سکندر جاہ کو بے بس کر دیا تھا مگر سال بھر بعد جب ارسطو جاہ مر گئے تو انگریزوں کو قدم جمانے کا پورا موقع مل گیا اور انہوں نے اپنے پرانے دوست میر عالم کو جنہوں نے دکن میں انگریزی اثر کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ کوشش کی تھی، اور جن کو لارڈ کارنوالس نے نواب غفراں مآب کی زندگی میں وزارت امور خارجہ کا عہدہ نسلاً بعد نسل دلوانے کا ارادہ کر لیا تھا[1] مدار المہامی پر مامور کرا دیا۔ گو انگریزی حکومت کو مدار المہام کے انتخاب اور تقرر کے مسئلہ میں بلکہ سرکار نظام کے کسی داخلی مسئلہ میں بھی مداخلت کا کوئی حق نہ تھا لیکن اگر نا جائز فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ملتا ہو تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا انگریزی ڈپلومیسی میں گناہ ہے اس لئے انگریزی سلطنت نے معاہدانہ پابندیوں کو بالائے طاق رکھکر سرکار آصفیہ کے اس خالص اندرونی مسئلہ میں پہلی مرتبہ مداخلت کی ابتدا کی اور میر عالم بہادر کے حق میں اپنا پورا زور صرف کر دیا برٹش رزیڈنٹ مسٹر رسل لکھتا ہے کہ

۱۸۰۴ء میں اعظم الامرا کے انتقال کے بعد ہم نے نظام پر میر عالم کو مسلط کر دیا۔

---

[1] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۸۳

لیکن اسی ارسل نے اپنے ۲۴ نومبر ۱۸۱۹ء کے ایک مراسلہ میں میر عالم کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔

"بلاشک وہ پبلک معاملات میں بڑی قابلیتوں کا مالک تھا، مگر دل کی ان خوبیوں سے قطعاً عاری تھا جو اعلیٰ دماغی قوتوں کی کمی کو پورا کرتی ہیں وہ حریص، بے حس کینہ پرور اور سنگدل تھا اس نے نہ کسی احسان کو یاد رکھا اور نہ کسی قصور کو بھلایا اگرچہ وہ سخاوت کے اظہار کا شوقین اور ہر دلعزیزی کا طلب گار تھا مگر اس کے دل میں اپنے ابنائے نوع کے لئے نہ منفرداً نہ مجتمعاً، کوئی جذبۂ ہمدردی تھا اس کے احوال اور اس کی قابلیتوں نے اس کو اپنی حکومت کے لئے عمدہ کام کرنے کی اتنی قدرت بہم پہونچائی تھی جتنی اس حکومت کے کسی ملازم کو کبھی حاصل نہیں ہوئی مگر اس نے بہت سی خرابیوں کو بڑھا دیا اور کسی ایک کو بھی کم نہ کیا، اس کا دور حکومت زیادہ تر نظام سے اقتدار چھیننے میں گذر گیا [1]"

یہ اس دیوان کی خصوصیات تھیں جس کو انگریزی حکومت اپنی اغراض کیلئے حیدرآباد کے منصب وزارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتی تھی مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے معاملات صرف یہیں تک نہیں رہے۔ بلکہ ان کا اپنا اثر بڑھانے کے لئے اس کے بعد پیہم مواقع ملتے چلے گئے۔ ۱۸۰۶ء میں میر عالم نے مہاراجہ چندولال کو اپنا پیش کار بنایا۔ ۱۸۰۸ء میں میر عالم کا بھی انتقال ہو گیا اور منصب وزارت کے لئے دو امیدوار آگے بڑھے۔ ایک شمس الامرا امیر کبیر دوسرے منیر الملک جو میر عالم کے داماد تھے۔ لارڈ منٹو نے شمس الامراء کی

---

[1] Hyderabad Affairs Vol. 11—P. 84

سفارش کی۔[1] مگر منیر الملک نے مہاراجہ چندو لال سے بحلف شرعی عہد کیا کہ اگر انہیں
دیوانی ملجائے تو وہ تمام اختیارات مہاراجہ کے سپرد کر دینگے۔ اور خود کسی معاملہ سے
سروکار نہ رکھیں گے۔[2] خود انگریزی سلطنت نے بھی منیر الملک کے تقرر کو اس شرط
کے ساتھ منظور کر لیا کہ وہ تمام اختیارات مہاراجہ چندو لال کو دیدیں۔ چنانچہ اسی
کے موافق عمل درآمد ہوا۔ اور مہاراجہ کو سیاہ و سپید کے اختیارات مل گئے جنہیں
وہ ۱۸۴۳ء تک پوری مطلق العنانی کے ساتھ استعمال کرتے رہے۔

اس زمانہ سے ریاست کے مصائب کا ایک ایسا المناک اور ماتم انگیز دور
شروع جس سے اس کا زندہ اور سلامت بچکر نکل آنا معجزہ سے کم نہیں ہے۔ یہاں
اس دور مصائب کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ
اس دور کی تین نمایاں خصوصیات تھیں ایک یہ کہ ریاست کی اندرونی معاملات
میں انگریزی حکومت کو مداخلت کا پورا موقع دیا گیا اور انگریزی رزیڈنٹ
کی خواہشات پر ریاست کے مفاد کو قربان کر دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ریاست کے
انتظام کو نااہل لوگوں پر چھوڑا گیا اور ذمہ دار عہدوں کے لئے اہلیت کا معیار
قابلیت کو نہیں بلکہ نذرانوں اور شخصی تعلقات کو قرار دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ
مداخل و مخارج کا توازن باقی نہ رہا اور قرض لیکر خسارہ کو پورا کرنا ریاست
کی مالی پالیسی کا ایک مستقل جزو بنگیا۔ حیدرآباد میں ایک انگریز ولیم پامر نے ساہوکا

---

[1] اس وقت شمس الامرا حیدرآباد کے اکابر میں سب سے زیادہ یورپین تہذیب کی طرف مائل تھے
اسی لئے گورنر جنرل کی نظر ان پر پڑی۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انگریزی
اغراض کے لئے منیر الملک سب سے زیادہ مفید تھے۔ [2] تاریخ رشید الدین خانی ص ۱۹۵

کی دوکان کھول رکھی تھی جس سے رزیڈنسی کا گہرا تعلق تھا اس سے ۲۴ فیصدی تک کی بھاری شرح سود پر رقمیں لی جاتیں اور انہیں دریا دلی کے ساتھ خرچ کیا جاتا تھا۔ اس طرح ۱۸۲۳ء تک ریاست ایک کروڑ ۱۶ لاکھ روپئے کی قرضدار ہوگئی جسے بھگتانے کی یہ صورت اختیار کی گئی کہ شمالی سرکار کا پیشکش ۷ لاکھ روپیہ سالانہ انگریزی حکومت کو ہمیشہ کے لئے معاف کیا گیا اور اس کے عوض یہ قرض اس نے اپنے ذمہ لے لیا اس کے بعد دوسرے مہاجنوں سے رقمیں قرض لی جاتی رہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے نواب سکندرجاہ نے اپنی زندگی میں ریاست کو ایک کروڑ روپیہ دیا اور ان کے بعد نواب ناصرالدولہ نے ۸۰ لاکھ روپیہ اپنے پاس سے دیا[1]۔ لیکن اس کے باوجود ریاست کی قرضداری کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۳ء میں مہاراجہ چندولال نے استعفاء دیا تو جنرل فریزر کے بیان کے مطابق تمام قرضوں کو ادا کرنے کے لئے ریاست کو دو کروڑ روپیہ کی ضرورت تھی اس کے علاوہ بہت سے ایسے ناجائز مصارف کا بار ریاست کے خزانہ پر پڑا ہوا تھا جنکی بدولت آخر ملک کا ایک قیمتی حصہ ریاست کو دینا پڑا

سیاسی مرتبہ میں کمی

اس بدانتظامی اور کمزوری کا راست نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے سیاسی مرتبہ کو سخت نقصان پہنچا۔ انگریزی حکومت کا اصول تو یہ ہے کہ "طاقتور کے سامنے سبک سری اور کمزور کے سامنے سرگرانی" جب تک نواب غفران مآب

---

[1] رشید الدین خانی صفحہ ۱۵۰ و صفحہ ۳۶۷

میر نظام علیخاں کے عہد میں ریاست کی بنیاد مضبوط تھی، انگریزی حکومت ان کی شاہانہ خود مختاری کا پورا احترام ملحوظ رکھتی تھی۔ اور ان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے سے کامل اجتناب کرتی تھی۔ سفارتی تعلقات میں دونوں سلطنتوں کے درمیان کامل مساوات تھی بلکہ ایک باجگذار حکومت ہونے کی حیثیت سے انگریزی حکومت کے لئے ایسے آداب مقرر تھے جو کمتر درجہ کے حلیف کیلئے موزوں ہوتے ہیں۔ لیکن نواب غفراں مآب کی آنکھ بند ہوتے ہی جب ریاست کو گھن لگنا شروع ہوا اور اس کی اندرونی طاقت مضمحل ہونے لگی تو انگریزی حکومت کا رویہ بھی بدلنے لگا۔

غفراں مآب کے عہد تک دونوں سلطنتوں میں برابر کے سفارتی تعلقات تھے۔ حیدرآباد میں رزیڈنٹ اور کلکتہ میں ایلچی رہتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۸۰۵ء میں جب میرزا عبداللطیف کی جگہ یار الدولہ کو ایلچی بنا کر بھیجا گیا تو گورنر جنرل نے ان کو ناپسند کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ واپس بھیجدیئے گئے۔ ان کے بعد پھر سفارت موقوف ہوئی، اور حیدرآباد کے رزیڈنٹ کے اندر دونوں عہدے جمع ہوگئے۔

غفراں مآب کے عہد تک رزیڈنٹ کو ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر ان کے بعد نواب سکندر جاہ کے عہد میں پہلے دیوان و پیشکار کے تقرر کے مسئلہ میں رزیڈنٹ نے علانیہ مداخلت کی پھر رفتہ رفتہ ملک کے انتظامی معاملات میں اس کا دخل بڑھتا رہا یہاں تک کہ مالگذاری کے بندوبست اور عہدہ داروں کے تقرر تک رزیڈنٹ کا حکم

بالاتر رہنے لگا۔ اور بادشاہ کے خلاف خود اس کے ملازموں کی پشتیبانی کرنا انگریزی حکومت کی پالیسی کا مستقل جزو بن گیا۔ حد یہ ہے کہ نظام سے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ا۔

"مہاراجہ چندو لال کی علیحدگی سے دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں فرق آجائے گا .... اگر ہز ہائی نس کے معاملات کا انصرام کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا گیا جس پر برٹش گورنمنٹ بھروسہ نہ کرسکتی ہو۔ تو ممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ ناگزیر ہوجائے کہ وہ اپنے مفاد کی نگہبانی کسی دوسرے ڈھنگ سے کرے۔ بجائے اس طریقہ کے جواب تک کام میں لایا گیا ہے[1]۔

اس سے ریاست میں جو ابتری پھیلی اس کا بیان خود انگریزی رزیڈنٹ کرنل اسٹوارٹ (. . . . .) کی زبان سے سننا چاہئے جو اس نے ۱۸۳۲ء میں گورنمنٹ آف انڈیا لکھا تھا۔

"جو لوگ اس دربار میں ۳۰ سال سے ہماری پالیسی کو دیکھ رہے ہیں جنہوں نے دیکھا ہے کہ ہم کس طرح خود اپنے بنائے ہوئے آدمیوں کو وزارت دلواتے ہیں اور خود ان کے بادشاہ کے خلاف ان کی حمایت کرتے ہیں۔ کس طرح ہم نے سرکار آمد فوج پر قابو حاصل کرلیا ہے اور کس طرح ہم ملک کے دیوانی انتظام پر حاوی ہوگئے ہیں وہ اس حقیقت میں مشکل سے کوئی شک کرسکتے ہیں اور سب سے کم خود نظام کو اس میں کوئی شک ہوسکتا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس ملک کا واقعی حکمراں سمجھ لیا ہے۔ بہت سی خرابیاں جو ریاست میں موجود ہیں

---

[1] Memoirs' of Fraser P. 358

بلاریب ہماری بے ضابطہ مداخلت کے ناگذیر نتائج ہیں اس لئے بات مشکل ہی سے درست ہوسکتی ہے کہ نظام اور ان کے دیوان کو جس حال میں وہ آج کل ہیں، ان خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا جائے میں نہیں سمجھتا کہ وہ انکو درست کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ درحقیقت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم خود ان خرابیوں کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں کیونکہ انہیں دفع کرنے کی قدرت ہم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔"

اس قسم کا اعتراف سرچارلس مٹکاف نے بھی کیا ہے جو برطانیہ کی سرکاری کتاب (بلیو بک) میں شائع ہوچکا ہے[ل]

نواب سکندر جاہ کے زمانہ تک ظاہری ادب آداب بدستور باقی تھے۔ گورنر جنرل اپنے آپ کو سرکاری مراسلات میں "نیازمند" لکھتا تھا۔ اور نظام اپنے لئے "مابدولت" کا لفظ استعمال کرتے تھے ۱۸۲۹ء میں جب انکا انتقال ہوا اور نواب ناصرالدولہ انکی جگہ مسند نشیں ہوئے تو ان کے ساتھ مساویانہ خط و کتابت شروع ہوگئی۔ میرعالم کے زمانہ میں دیوان ریاست سے گورنر جنرل کی خط و کتابت برابر کے دوستوں کی سی ہوتی تھی مگر ۱۸۴۷ء میں جب سراج الملک نے دیوانی کے عہدہ پر سرفراز ہوکر انہی آداب و القاب کو استعمال کیا تو گورنمنٹ کی طرف سے صاف لکھدیا گیا کہ:۔

"ہندوستان کے حالات اب اسوقت بہت بدل چکے ہیں جبکہ ان کے پیشرو میرعالم کو یہ القاب ۴۰ برس پیشتر لکھے گئے تھے جنہیں اب مثال کے طور پر پیش کیا

ل Memoirs— P. 86

جاتا ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل اور حیدرآباد کے دیوان کی اعتباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ برٹش گورنمنٹ کے نمائندے کو اس طریقہ سے خطاب کیا جائے جو ایک زیر حمایت اور امداد پانیوالی ریاست کے وزیر کے ساتھ مساوات کو پہونچتا ہو[1]

اس کے بعد رفتہ رفتہ رزیڈنٹ نے بھی ادب آداب کو رخصت کرنا شروع کیا۔ نواب ناصر الدولہ کے ابتدائی زمانہ میں جنرل فریزر شکایت کرتا ہے کہ یہاں کے آداب بہت تکلیف دہ ہیں[2] مگر انہی کے آخری زمانہ میں جب کرنل لو رزیڈنٹ ہوکر جاتا ہے تو وہ دربار میں نہایت گستاخانہ طرز عمل اختیار کرتا ہے صاحب تاریخ رشید الدین خانی لکھتا ہے کہ

"چونکہ جان لو صاحب نے دربار گذشتہ وحال میں مثل سفیران سابق کے لحاظ اور آداب حضور کا نشست و برخاست اور کلام میں نہ کیا اکثر گستاخانہ اور بیباکانہ کلمات سے پیش آئے اس سے خود بدولت اپنے نزدیک چندے بہت آزردہ خاطر رہے اور خیلے دلپر ملال گذرا (صفحہ ۳۸، و ۳۹)

نواب افضل الدولہ بہادر کے زمانہ تک بھی بہت کچھ پرانے نیاز مندانہ آداب کی پابندی باقی تھی۔ لیکن نواب میر محبوب علیخاں مرحوم کی کم سنی کے زمانہ سے

---

[1] Memoirs P. 217

[2] فریزر لکھتا ہے کہ نظام سے ملاقات بہت مراسم اور تکلفات کے ساتھ ہوتی ہے اور رزیڈنٹ سے ایسے مواقع پر جن آداب کی پابندی کرائی جاتی ہے وہ اس دربار کے ساتھ ہمارے ابتدائی تعلقات کے زمانے سے رسماً چلے آرہے ہیں اور کچھ ایسی نوعیت کے ہیں کہ ان کو حکومت عالیہ اور دیسی ریاستوں کی موجودہ اعتباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے رزیڈنٹ کی نمائندہ پوزیشن کے مناسب حال نہیں دیکھتا۔ میموئرز آف فریزر صفحہ ۱۹۳

ان میں کمی شروع ہوئی یہاں تک کہ اب رزیڈینٹ ان تمام درباری آداب سے مستثنیٰ ہو چکا ہے جو ریاست میں رائج ہیں۔

لیکن اس دور انحطاط میں سب سے زیادہ ریاست کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی اصلی المناک داستان کچھ دوسری ہے جس کو اختصار کے ساتھ آگے بیان کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کنٹنجنٹ کا قیام

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۷ کے مطابق جمعیت تعلبندی کے فرائض یہ مقرر کئے تھے کہ وہ ان لوگوں کی سرکوبی کرے گی جو سرکار نظام کے جائز مطالبات ادا کرنے سے گریز کریں گے۔ یا سرکار کے ممالک محروسہ میں بدامنی پھیلائیں گے۔ لیکن اس معاہدہ کے گیارہ ہی مہینے بعد جب شوراپور کے زمیندار نے خراج دینے سے انکار کیا تو کمپنی نے فوج بھیجنے میں بہت حیلہ حجت کی اور ۶ مہینہ بعد اسے بھیجا بھی تو ایسی شرائط پر جو خلاف معاہدہ تھیں اس کے بعد پہلی جنگ مرہٹہ پیش آئی جس میں نظام نے معاہدہ کے مطابق ایک زبردست فوج سے کمپنی کی مدد کی اور اس نے بہت مفید خدمات انجام دیں لیکن اس فوج میں بہت سے عیوب نکالے گئے اور کہا گیا کہ اس نے کچھ کام نہیں کیا۔[1] ان چالوں کا مقصد یہ تھا کہ نظام کو ایک اور فوج خود اپنے خرچ پر رکھنے کی صلاح دیجائے چنانچہ ۱۸۰۳ء میں گورنر جنرل نے نظام سے اصرار کیا کہ وہ ایک نئی فوج کمپنی کے زیر انتظام قائم کریں جس کا کام سرکش زمینداروں اور باغیوں کی

---

[1] تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۶ و صفحہ ۷

سرکوبی کرنا ہو۔ یہ بالکل وہی خدمت تھی[1] جس کو انجام دینے کیلئے ۶۲ لاکھ کا ملک دیکر نظام نے جمعیت تغلبندی قائم کرائی تھی اس لئے انہوں نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کمپنی کی حکومت نے اس پر یہاں تک زور دیا کہ اتحاد کو منسوخ کرنے کی دھمکی دیدی اور نظام کو ڈرایا کہ اگر اتحاد منسوخ ہوگیا تو آپکی ریاست کمپنی کے مقبوضات سے ملحق کرلی جائے گی[2]۔ مگر جب دھمکیوں سے بھی کام نہ چلا تو ۱۸۱۳ء میں ہنری رسل رزیڈنٹ اور مہاراجہ چندو لال پیشکار نے باہمی اتفاق سے دو ہزار سواروں کی ایک فوج قائم کرلی جس کا نام رسل بریگیڈ رکھا گیا[3]۔ بعد میں بڑھاتے بڑھاتے اسکو چہار چند کردیا گیا اس کے اخراجات کیلئے تقریباً ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا بار ریاست کے خزانہ پر ڈالا گیا اور یہی فوج حیدرآباد کنٹیجنٹ بن گئی اس فوج کے قیام کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ چونکہ جمعیت تغلبندی کمپنی کے زیر اثر ہے اور ضرورت کے وقت اسکی خدمات فوراً حاصل نہیں کیجاسکتیں اس لئے ایک باضابطہ فوج خود ریاست کے زیر حکم رہنی چاہئے تاکہ اس سے فوراً کام لیا جاسکے لیکن یہ محض ایک دھوکہ تھا دراصل یہ فوج بالکل رزیڈنٹ کے ماتحت تھی ریاست کو اس پر مطلق اختیار نہ تھا۔ رزیڈنٹ ہی اس کا افسر اعلیٰ تھا اسی کو عزل و نصب اختیار تھا اسی کی اجازت پر اس کی نقل و حرکت منحصر تھی اور اس کے حکم کے بغیر کنٹیجنٹ کے ایک سپاہی سے بھی ریاست کی کوئی خدمت نہیں لیجاسکتی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کنٹیجنٹ کا قیام نظام کی اجازت کے بغیر عمل میں

---

[1] Wellingtons Despatches Jan. 19—1805

[2] تاریخ رشید الدین خانی ص۱۲۱

آیا۔ اور نظام کی مرضی کے خلاف اس کو قائم رکھا گیا ہے ریکارڈ پر کافی ثبوت موجود ہے۔ لارڈ مٹکاف نے اپنی ۱۶ مارچ ۱۸۳۲ء کی یادداشت میں صاف لکھا ہے کہ

"کنٹیجنٹ فورس درحقیقت ہمارے اور راجہ چندولال کے درمیان ایک مشترکہ کاروبار ہے۔[۱]"

سر فریڈرک کری جو لارڈ ڈلہوزی کی کونسل کا ایک رکن تھا ۲۔ اپریل ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ

"کنٹیجنٹ دراصل مسٹر رسل ریذیڈنٹ اور اس زمانہ کے وزیر چندولال کی باہمی سخت ونرم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اور جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں اس انتظام کے لئے نظام اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں کی جانب سے کوئی راست منظوری ریکارڈ پر موجود نہیں ہے۔[۲]"

۱۸۲۶ء میں جب کنٹیجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے نواب سکندر جاہ کے ذاتی خزانہ سے روپیہ مانگا گیا تو انہوں نے اس کے دینے سے صاف انکار کر دیا۔[۳] ۱۸۳۳ء میں نواب ناصر الدولہ نے کنٹیجنٹ کی بقا کی سختی کے ساتھ مخالفت کی[۴] ۱۸۳۴ء میں انہوں نے کرنل استوارٹ (ریذیڈنٹ سے باصرار کہا کہ جس طرح میرے دیوانی

---

[۱] Hyderabad Affairs Vol. 11—P. 247

[۲] ,, 623

[۳] ,, P. 374

[۴] میموآئیر صفحہ ۱۶۵

انتظام سے انگریز افسر ہٹائے گئے ہیں اسی طرح میری فوج سے بھی ان کو ہٹالیا جائے میری فوج کو اب کنٹیجنٹ کی حاجت نہیں ہے[۱] جنرل فریزر (رزیڈنٹ) اپنے ۲۶ جولائی ۱۸۴۲ء کے مراسلہ میں حکومت ہند کو اطلاع دیتا ہے کہ۔

اگر نظام کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا گیا کہ وہ فی الواقع خود مختار ہیں تو پہلا کام جو وہ کریں گے وہ یہ ہوگا کہ کنٹیجنٹ کی برطرفی کا مطالبہ کریں گے جس سے انکی ناراضی معلوم ہے اور جس کے قیام اور دائمی بقا کے لئے کسی موجودالوقت معاہدہ میں کوئی شرط موجود نہیں ہے[۲]

۱۸۵۳ء میں جب معاہدہ تفویض برار کیلئے برطانی رزیڈنٹ کرنل لو نواب ناصرالدولہ سے گفت و شنید کررہا تھا تو نواب ناصرالدولہ نے پھر اس امر واقعہ کا اعادہ کیا کہ کنٹیجنٹ کا قیام نواب سکندرجاہ کی اجازت کے بغیر عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آخری جنگ مرہٹہ (۱۸۱۸ء) کے بعد سے کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں ہماری مدد کی ضرورت ہوتی۔ کرنل لو نے جواب دیا کہ یہ فوج آپ کے والد صاحب کی اجازت سے قائم کی گئی ہے۔ نواب نے فرمایا کہ "میرے والد کا نام نہ لو یہ کہو کہ مہاراجہ کی اجازت سے قائم کی گئی[۳]۔ نواب ناصرالدولہ کے اس استدلال کے جواب میں کرنل لو اور خود لارڈ ڈلہوزی نے اس وقت یہ دلیل پیش کی تھی کہ جب نواب سکندرجاہ نے مہاراجہ چندولال کو مختار کل بنادیا تھا تو مہاراجہ

لہ	۹۰	میموآئیرز صفحہ

لہ	Hyderabad Affairs .Vol. P 576

لہ۳	Hyderabad Affairs Vol. 11—P. 375

کی منظوری خود نواب کی منظوری تھی لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ سر چارلس مٹکاف جیسا مستند اور معتبر شخص جو نواب سکندر جاہ کے زمانہ میں پانچ سال تک سلطنت برطانیہ کا رزیڈنٹ رہ چکا ہے۔ بالفاظ صریح اس کا اعتراف کرتا ہے کہ انگریزی حکومت نے زبردستی نواب سکندر جاہ کو بے اختیار کیا اور انکی مرضی کے خلاف ان کے وزراء کو استعمال کرتی رہی۔ ۳۰ اگست ۱۸۲۹ء کی ایک تحریر میں یہ مامور برطانی مدبر لکھتا ہے :-

"۱۸۰۰ء کے عہدنامہ کے بعد ہی سے یہ ضروری سمجھ لیا گیا تھا کہ ریاست کا وزیر ہمارے مفید مطلب ہونا چاہئے اور ہمیں اپنے اثر سے اس کی تائید کرنی چاہئے ..... ہمارے رزیڈنٹ نے ہز ہائی نس (نواب سکندر جاہ) کو انکی تخت نشینی کے وقت اپنا مقصد صاف بتا دیا تھا ..... چنانچہ ارسطو جاہ مرتے دم تک وزیر رہے۔ اور اس تمام مدت میں انہوں نے اپنے آقا یعنے نظام حال کو بے وقعت حلقہ بگوش اور محروم الاقتدار رکھا۔ وزیر کی وفات پر نظام نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ معاملات سلطنت کو خود انجام دینا چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے تھے کہ پھر کوئی مطلق العنان وزیر ان پر مسلط کیا جائے مگر جو انتظام وہ چاہتے تھے اس پر ہماری گورنمنٹ کو اعتراض تھا، ہم نے اصرار کیا کہ ایک وزیر کامل اختیارات کیساتھ مقرر کیا جائے ہم نے اپنا حق جتایا کہ وزیر ہمارے مفاد سے وابستہ اور ہمارا منتخب کردہ ہونا چاہئے اور اگر ضرورت ہو تو ہمیں اس کے تقرر پر زور دینا چاہئے مگر انتہائی کارروائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"میر عالم جنکو ہمنے منتخب کیا تھا۔ وزیر مقرر کر دیئے گئے اور مرتے دم تک اپنے آقا کی مملکت کے بلا شرکت احدے حکمراں رہے۔ نظام نے خود اپنی سلطنت میں اختیارات کا کچھ حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر یہ وزیر کو گوارا نہ تھا اور رزیڈنٹ اسکی مدد پر تھا۔ آخر نظام شکستہ خاطر ہو کر دست کش ہو گئے اور اس وقت سے انہوں نے سلطنت کے معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ گوشۂ عزلت میں افسردہ و غمگین زندگی بسر کرتے رہے اس طرح ہمارے اثر نے حیدرآباد کے وزیر کو اس کے اپنے آقا کی مرضی کے خلاف مطلق العنان حکمراں بنا دیا برطانی مفاد کی تمام معاملات میں وہ برطانی رزیڈنٹ کا تابع فرمان تھا..... اسکی مخالفت کو ہمارے خلاف دشمنی اور انگریزی سلطنت کے ساتھ بیوفائی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔"

"میر عالم کے انتقال کے بعد نظام نے دوبارہ اپنے امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا مگر بے نتیجہ۔ ان کو ایک وزیر مقرر کرنے پر مجبور کیا گیا اور غیر معمولی انتظام عمل میں آیا کہ نظام کے منتخب کردہ شخص منیر الملک کو عہدۂ وزارت دیا گیا مگر یہ شرط کر لی گئی کہ ریاست میں ان کے اختیارات کچھ نہونگے تمام اختیارات نائب وزیر چندولال کو دیئے گئے جو ہمارے زیر اثر تھے۔ چنانچہ اس وقت سے ہماری مداخلت کی بدولت رئیس وقت خود اپنی سلطنت کے معاملات سے الگ کر دیا گیا۔"

"وزیر اعظم بھی اسی طرح الگ بٹھا دیا گیا اور حقیقی وزیر کامل طور پر ہمارا تابع فرمان ہو گیا۔"

"اپنے اثر اور عمل و دخل کو بڑھانے کے سلسلہ میں ہمارا دوسرا قدم یہ تھا کہ ہم نے نظام کی فوج کو ہٹا کر اسکی جگہ خود اپنی فوج کو رکھنا شروع کر دیا جو برطانی

افسروں کے ماتحت قائم کی گئی تھی.... ہم نے اسکی عمومی نگرانی اور تنظیم سے ابتداً کی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اب نظام کے خزانہ سے ۴۰ لاکھ سے اوپر رقم ایک ایسی فوج پر خرچ ہوتی ہے جو کلیتہً برطانی افسروں کے زیر قیادت ہے اور جس پر برطانی رزیڈنٹ کو بلا شرکت احدے، کلی اختیارات حاصل ہیں۔ یہ انتظام صرف اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ وزیر ہمارا بالکل تابعدار ہے کیونکہ اس کارروائی کو دربار اور قومی فوج کے افسروں کیلئے قدرتی طور پر سخت ناگوار خاطر ہونا چاہئے۔[1]

۱۴ اگست ۱۸۲۶ء کی ایک اور تحریر میں مٹکاف لکھتا ہے۔

"نظام نے اپنے شاہی حقوق کو برقرار رکھنے کیلئے جو کوشش کی۔ اسکو زبردستی دبا دیا گیا۔ رئیس وقت خود اپنی مملکت میں محض ایک سرکاری وظیفہ خوار کی حیثیت رکھتا ہے اس کا دماغ غالباً فطری طور پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے ناقابل نہیں ہے مگر ممکن ہے کہ طویل عرصہ تک افسردہ اور گوشہ نشین زندگی بسر کرنے کے باعث متاثر ہو گیا ہو... میں اس رئیس کی حالت سے زیادہ قابل رحم اور اس سے زیادہ ناقابل التزام حالت کا تصور نہیں کرسکتا جسے اسطرح خود اپنے ملازم کا ماتحت بنا دیا گیا ہو، اور ایک خارجی طاقت اس ملازم کی حامی بن گئی ہو نظام کے ممالک محروسہ میں اس قسم کی فوج (یعنی کنٹنجنٹ) کا رزیڈنٹ کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا اور خود نظام کے خرچ پر نظام کے دبانے کا ذریعہ بننا حیدرآباد کے وزیر کی تابعداری ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے۔"[2]

یہ کسی اور کے نہیں خود برطانی حکومت کے ایک سابق رزیڈنٹ کے

---

[1] Hyderabad Affairs Vol.P. 299—300

[2] " " " P. 375.

اعترافات ہیں جن سے اس امر کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ نواب مغفرت منزل سکندر جاہ بہادر کی اجازت کے بغیر قائم کی گئی اور معاہدات کے بالکل خلاف ریاست پر یہ بار محض ایک بیشکار کی رضامندی سے ڈالدیا گیا جسے خود انگریزی حکومت نے، نہ کہ ملک کے جائز حکمران نے ریاست کا مختار کل بنا دیا تھا۔

کنٹنجنٹ کی اصلیت

اب رہا یہ سوال کہ اس فوج کے قیام کا اصلی مقصد کیا تھا اور وہ کہاں تک جائز بنیاد پر رکھی گئی تھی سو اس کے متعلق اپنی طرف سے ایک لفظ کہے بغیر میں خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان کے بیانات یہاں نقل کرتا ہوں
۲۴ اپریل ۱۸۴۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ڈائرکٹر سر جیمس لا نے حیدرآباد کے متعہم رزیڈنٹ کرنل لو کو ایک طویل خط لکھا تھا جس میں وہ لکھتا ہے کہ

"میں کچھ عرصہ سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ بڑی حد تک ہم خود نظام کی مالی مشکلات کے باعث ہیں ہم نے نظام پر اپنے مطالبات کا بار ڈالدیا ہے جن کے ہم کسی معاہدہ کی رو سے مستحق نہیں ہیں۔ ۱۲ اکتوبر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی بارہویں دفعہ کی رو سے نظام نے اپنے اوپر اس بات کا ذمہ لیا تھا کہ جنگ کے موقع پر وہ ۶ ہزار پیدل اور ۹ ہزار سوار دیں گے جس کو کنٹنجنٹ فورس کا نام دیا گیا تھا یہ فوج رزیڈنٹ کی درخواست پر ۱۸۰۳ء میں مہیا کی گئی اور اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگ میں عمدہ خدمات انجام دیں مگر دوسرے سال جو فوج مہیا کیگئی وہ تعداد اور

بلیت کے لحاظ سے اتنی ادنیٰ تھی کہ رزیڈنٹ کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ نظام کی ملازمت میں برطانی افسروں کے ماتحت ایک باقاعدہ رسالہ قائم کیا جائے ۱۸۱۳ء میں اصلاح کا ایک خاکہ منظور کیا گیا اور اس پر عمل درآمد ہوا پھر ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۶ء میں مزید اصلاحات کی گئیں یہاں تک کہ ۱۸۴۲ء کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کنٹنجنٹ میں ۲۵۹۲ سوار ۶۸۳۵ پیدل اور ۹۵ یوروپین افسر ہیں جن کا نظام کی حکومت پر ۴۲ لاکھ روپیہ (حالی) سالانہ خرچ ڈالدیا گیا ہے یہ مطالبہ ریاست کی کل آمدنی کا ۱/۴ حصہ ہضم کر جاتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نظام اس وقت ان رقوم کے قرضدار ہیں جو برٹش گورنمنٹ نے کنٹنجنٹ کے مصارف کیلئے انکو قرض دی ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں یقیناً یہ رائے رکھتا ہوں کہ کنٹنجنٹ کی برطرفی پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نہ اس کا ابتدائی قیام کسی معاہدہ پر مبنی ہے اور نہ استمراری بقا[1]

اس کے جواب میں کرنل لو[2] نے ۲۴ جون ۱۸۴۹ء کو ایک خط لکھا جس کے بعض خاص حصے یہ ہیں۔

"میں نے ۱۸۳۸ء میں لارڈ آکلینڈ کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر کالون کو جو نیم سکریٹری خط لکھا تھا اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں اس جرم بیرحمی کے متعلق آپ کی رائے سے کس قدر متفق ہوں جس کا ارتکاب ہم سالہا سال سے

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۲۴۷

[2] یہ وہی کرنل لو ہے جو ۱۸۵۳ء میں حیدرآباد کا رزیڈنٹ بنایا گیا اور جس نے نظام پر فوجی قوت کا دباؤ ڈالکر تفویض برار کے عہدنامہ پر دستخط حاصل کئے۔

حکومت نظام کے ساتھ انکی آمدنی پر کنٹنجنٹ کی تنخواہ کے لئے ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ
کا خرچ عائد کرنے کی صورت میں کر رہے ہیں جو دوسرے الفاظ میں خود ہماری
ہی اغراض کے لئے ہے نہ کہ نظام کی اغراض کے لئے ۱۸۱۹ء سے دکن میں کامل
امن ہے اور چونکہ ہم صرف حالت جنگ میں نظام کی فوج سے ۶ ہزار پیدل
اور ۹ ہزار سوار مانگنے کا حق رکھتے ہیں اس لئے از روئے معاہدہ ہم کو اس
پوری مدت یعنی ۲۰ برس سے زیادہ کی مدت میں کنٹنجنٹ کیلئے نظام سے ایک روپیہ
بھی مانگنے کا حق نہ تھا مگر اس مدت میں ہم نے نظام کے خزانہ سے (ماسوا اس
۴۲ لاکھ کے جو اب کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں قرض کے طور پر نظام کے ذمہ واجب الادا ہے
۱۱ کروڑ ۲۰ لاکھ حالی کی رقم خطیر کھینچ لی ہے جس کا ایک بڑا حصہ نظام کے ممالک محروسہ
سے ہمیشہ کیلئے سپاہیوں و افسروں کی ترسیل زر و پس انداز کی صورت میں باہر چلا گیا ہے
کیونکہ ان سپاہیوں اور افسروں کا ۳/۴ حصہ اودھ، روہیلکھنڈ اور دوسرے اقطاع
ہند سے آیا ہوا ہے جو اپنے بچائے ہوئے روپے کو زر نقد کی صورت میں دور دراز
علاقوں کو لیجاتے ہیں اور اسطرح یہ دولت کی نکاسی نہ صرف نظام کے خزانہ کو
خالی کئے دیتی ہے بلکہ انکی رعایا کو بھی روز بروز مفلس بنا رہی ہے..... مجھے یاد ہے
کہ میں نے ۱۸۳۲ء میں مسٹر کالون کو بتایا تھا کہ ۱۸۱۹ء سے ابتک موجودہ فوج
کا نصف حصہ ۲۰ لاکھ کے خرچ پر وہی خدمات حکومت نظام کیلئے انجام دے
سکتا تھا جو موجودہ فوج ۴۰ لاکھ کے خرچ سے انجام دے رہی ہے۔ برسوں سے
کنٹنجنٹ کے ایک بڑے حصہ سے کوئی کام نہیں لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں معاہدہ
کی رو سے نظام کو کمپنی کی جمعیت نعلبندی سے ہر وہ خدمت لینے کا حق ہے

جو کنٹنجنٹ سے لی جاتی ہے یا لی جا سکتی ہے۔ اب دیکھئے کہ اگر ۱۸۱۹ء سے صرف ۲۰ لاکھ کی فوج رکھی جاتی تو کیا ہوتا۔ بالکل ظاہر ہے کہ ابتک ہم نظام کے خزانے سے اس رقم کی بہ نسبت جو ابتک ہم نے وصول کی ہے ۵ کروڑ کم وصول کرتے یہ فرق تو نظام کے حق میں ہوتا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں کیا ہوتا؟ میری رائے یہ ہے کہ کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ ۱۸۱۹ء سے ہم نے ایک مرتبہ بھی کنٹنجنٹ کو نظام کے حدود سے باہر استعمال نہیں کیا ہے۔ ...... اسکے بعد اس بارے میں اور کیا کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ دیسی حکومت اپنے بھاری قرضوں اور خالی خزانہ کے باعث کیوں قریب قریب معطل سی ہو گئی ہے۔[1]

کورٹ آف ڈائرکٹرز کا ایک دوسرا رکن سر مہری دلاک اپنی ۹ نومبر ۱۸۵۱ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ:-

”نظام کی بہترین بے قاعدہ فوج کو رفتہ رفتہ ہم نے اپنی نگرانی میں ایک باقاعدہ کنٹنجنٹ کی صورت دیکر نواب کو ان لوگوں کی خدمات سے محروم کردیا جو ان کے ذاتی محافظ تھے اور جن کی قوت پر تحصیل اور پولیس کے افسر مالگذاری وصول کرنے اور امن قائم کرنے کے کام میں بھروسہ کرسکتے تھے اسطرح ہم نے نظام کو مجبور کردیا کہ وہ نظم و نسق کو چلانے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لئے پٹھانوں، روہیلوں اور عربوں کی ایک نہایت قابل اعتراض فوج بھرتی کریں۔[2]“

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۲۴۸

[2] ” ” ۲۶۰

کورٹ کا ایک اور رکن جنرل کالنیلڈ (Caulfield) لکھتا ہے:

"ہم نے نظام پر ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ کا ایک غیر ضروری خرچ ایک ایسی کنٹنجنٹ کی پرداخت کے لئے عائد کر دیا ہے جسکی تنظیم و ترتیب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس پر ہمارے ہی افسر مقرر ہیں۔ اور جس کا وہی کام ہے جو معاہدہ کی رو سے جمعیتہ نعلبندی کے سپرد کیا گیا تھا۔ ہم نے نظام کو جمعیت نعلبندی کی خدمات سے ایسے وجوہ کی بنا پر محروم کیا ہے جنکی حمایت میں کوئی عذر نہیں پیش کیا جا سکتا۔"[1]

کنٹنجنٹ کا بانی سر ہنری رسل لکھتا ہے۔

"یہ فوج صرف برائے نام نظام کی ملازم تھی، اس کو ہر مہینہ رزیڈنٹ کے خزانہ سے باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی اور وہ اپنے آپ کو کمپنی ہی کی فوج سمجھتی تھی، عملی اغراض کے لئے یہ فوج بھی ہمارے لئے ایسی ہی تھی جیسی خود ہماری فوج اور اسکو بھی ہم اپنے فوج کی طرح کام میں لا سکتے تھے۔"[2]

سنہ ۱۸۱۰ء میں جب رسل نے اس فوج کے قیام کی تجویز پیش کی تھی تو اس وقت بھی اس نے اپنے ۲۲ جون کے مراسلہ میں صاف لکھدیا تھا کہ یہ فوج جمعیتہ نعلبندی (سبسیڈیری فورس) کو اس محنت سے بچانے کے لئے مطلوب ہے جو اسے سرکش رعایا کی سرکوبی میں کرنی پڑتی ہے۔[3] حالانکہ سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ میں نظام نے اسی مقصد کے لئے برٹش گورنمنٹ کو ۶۳ لاکھ کا ملک دیکر جمعیت

سلہ میمو آئیرز صفحہ ۲۶۰

سلہ Hyderabad Affairs Vol. II—P. 322

سلہ " " " P. 372

نعلبندی قائم کرائی تھی۔

پھر جس وقت کنٹنجنٹ کو مستقل کیا جا رہا تھا تو خود گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز نے ۹ نومبر ۱۸۱۹ء کی یادداشت میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ فوجیں اس بادشاہ کی بہ نسبت جس کے خرچ پر وہ رکھی جارہی ہیں، درحقیقت زیادہ تر ہماری فوجیں ہیں اگرچہ ان کا خرچ نظام دیتے ہیں اور برائے نام وہ انکی طرف منسوب ہیں مگر ان کا ہمارے ذریعے تنخواہیں پانا، اور برطانوی افسروں کی قیادت میں رہنا اس بات کی توقع کی گنجائش رکھتا ہے کہ دونوں حکومتوں کے درمیان کشیدگی کی صورت میں وہ اپنے ظاہری آقا کے مقابلہ میں ہمارا ساتھ دیں گے اب کیا یہ عقل و خرد کے مطابق ہوگا اور کیا یہ اس اعتماد کے لئے جو آنریبل کمپنی نے ہم پر کیا ہے مناسب ہوگا کہ ہم ایسی ایک ضمانت کو انصاف کے ایک اعتقادی نکتہ پر قربان کردیں ..... یہ بالکل خلاف مقتضائے سیاست ہوگا کہ ہم ضرورت سے زیادہ تہذیب کا خیال کرکے اپنی طاقت میں اس مفت کے اضافہ کو خواہ مخواہ چھوڑ دیں۔"[۵۱]

۷ ار جنوری ۱۸۴۰ء کو کنٹنجنٹ کے انگریز افسروں کی تنخواہوں کا مطالبہ کرنے کی قانونی مشکلات بیان کرتے ہوئے انگریزی رزیڈنٹ فریزر لکھتا ہے۔

"یہ فوج خود صبر و تحمل پر جی رہی ہے اگر اس پر فیصلہ کن اعتراضات کئے گئے تو خواہ ہم اسکو برقرار رکھنے کے لئے اصرار کرنے پر قادر رہوں مگر ہمیں اپنے اس

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۳۵۷

اصرار کو موجودہ اوقت معاہدات کا حوالہ دیکر یا کسی ایسے سمجھوتہ کو پیش کر کے جو اس بارے میں ہمارے اور ہزہائی نس نظام کے درمیان ہوا ہو حق بجانب ثابت کرنا مشکل ہوگا اس لئے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ایسی تجاویز پیش کرنے سے احتراز کیا جائے جنکو یہ دیسی ریاست یقیناً حق بجانب نہیں سمجھتی اور جن سے ایسے مسائل اور مجوزات پیش ہونے کا امکان ہے جو خود اس فوج کے نفس وجود کے متعلق ہوں گے۔" (میموائرز صفحہ ۹۰)

اس کے بعد فریزر نے ۴ ار جولائی ۱۸۴۲ء کو پھر لکھا ہے کہ:۔

"اگر ہم نے نظام پر یہ اثر قائم ہو جانے دیا تو یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ علاوہ دوسری خرابیوں کے ہم کو اس بزرگ تر خرابی کا مقابلہ کرنا پڑے گا کہ ہز ہائی نس کی جانب سے کنٹنجنٹ کی برطرفی کی تجویز پیش کی جائے گی جس سے ان کی ناراضی معلوم ہے اور جس کے نہ ابتدائی قیام کیلئے کسی معاہدہ میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ سلسل برقرار رکھنے کیلئے ۱۸۳۳ء میں ہز ہائی نس نے اس فوج کے برقرار رہنے پر فعلاً اعتراضات کئے تھے اور اس پر جو مصارف ہو رہے ہیں وہ دیوان کی طرف سے پیہم شکایات کے موجب ہیں۔" (میموائرز صفحہ ۱۶۵)

خود لارڈ ڈلہوزی جس نے اسی کنٹنجنٹ کی خاطر نظام سے زبردستی ملک برار حاصل کیا۔ اپنی ۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ

"ان وجوہ کی بناء پر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ حکومت ہند کو نہ تو معاہدہ ۱۸۰۰ء کی اسپرٹ سے اور نہ الفاظ سے اس کا کوئی حق پہنچتا ہے کہ نظام سے کنٹنجنٹ کو اسکی موجودہ شکل میں

قائم رکھنے کا مطالبہ کرے۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایک ایماندار آدمی ہونے کی حیثیت سے رزیڈنٹ کو یہ ہدایت دینے کے لئے ہرگز راضی نہیں ہوں کہ وہ نظام کے جواب میں یہ کہے کہ کنٹینجنٹ ۱۸۱۶ء سے اب تک ان کے خرچ پر اس وجہ سے رکھی گئی ہے کہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی بارہویں دفعہ کی رو سے وہ اس کے رکھنے کے پابند ہیں" [۱]

۱۶ ستمبر ۱۸۵۲ء کو لارڈ ڈلہوزی نے اپنے ایک پرائیوٹ خط میں جنرل فریزر کو لکھا تھا کہ۔

"گورنمنٹ آف انڈیا بار بار ازروئے معاہدہ کنٹینجنٹ رکھنے کی ذمہ داری کا ذکر کرتی ہے۔ کیونکہ چالیس سال سے نظام نے معاہدہ ۱۸۰۰ء کی بارہویں دفعہ کی اس تعبیر کو قبول کر لیا ہے [۲]۔ لیکن اگر نظام اس سے مکر جائیں اور ازروئے معاہدہ کسی پابندی کے وجود سے انکار کر دیں تو میں ایک پبلک مین کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں ایمانداری کے ساتھ ایسا استدلال نہیں کر سکوں گا کہ کنٹینجنٹ کو برقرار رکھنے کے لئے سابقہ عمل کے سوا کوئی اور بھی حجت موجود ہے میں یہ استدلال کر سکتا ہوں اور یہی میں نے کیا ہے"

---

۱ میمو آئیرز صفحہ ۳۶۰

۲ یہ بھی غلط ہے کہ نظام نے اس تعبیر کو قبول کر لیا۔ خود جنرل فریزر (رزیڈنٹ) نے اس خط میں لکھ دیا تھا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے ۱ اکتوبر ۱۸۵۰ء سے پہلے نظام نے کبھی صریح الفاظ میں اس جواب کو قبول نہیں کیا (دیکھو میمو آئرز صفحہ ۳۸۱

کہ ہز ہائینس کے طرز عمل (؟ یعنی خاموشی) نے معاہدہ کو یہ صورت دیدی ہے اور جب تک اسے نامنظور نہ کر دیا جائے ان پر یہ واجب ہے کہ سیدھی طرح اس فوج کا خرچ برداشت کریں۔ جس کو اسی تعبیر کے مطابق انہوں نے ہمیں مرتب کرنے دیا ہے۔ لیکن اگر وہ نفس معاہدہ پر قائم ہو جائیں تو میں یہ استدلال نہیں کر سکتا کہ معاہدہ کی اسپرٹ یا الفاظ کی رو سے وہ اس بناء پر حالت امن میں ۹ ہزار کی ایک گراں خرچ فوج رکھنے پر مجبور ہیں کیونکہ حالت جنگ میں انہوں نے ۱۵ ہزار فوج دینے کی ذمہ داری لی ہے۔"

اپنی ایک اور خفیہ تحریر میں لارڈ ڈلہوزی لکھتا ہے۔

"عہدنامہ کے تصور میں بھی یہ نہ تھا کہ نظام کو اپنی فوج سے الگ ایک فوج بھرتی کرنے اور اس کا خرچ دینے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ ہر وقت زمانہ امن اور زمانہ جنگ میں یکساں گورنمنٹ آف انڈیا کے تنہا تصرف میں دیدی جائے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ میں نے کہتے سنا ہے کہ ہز ہائنس کی اپنی فوج محض ایک "انبوہ" ہے[۱]۔ اور یہ کہ جنگ ہونے کی صورت میں بھی

---

[۱] عجیب لطف یہ ہے کہ انہی لارڈ ڈلہوزی صاحب نے ۱۳ اکتوبر ۱۸۴۹ء کو اپنے ایک سرکاری مراسلہ میں لکھا تھا کہ۔

"۱۸۰۰ء کے عہدنامہ نے ہم کو ہر وقت نظام سے ۱۵ ہزار فوج طلب کرنے کا حق دیا تھا۔ تجربہ نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ جب کبھی یہ مطالبہ کیا گیا ہم کو ۱۵ ہزار فوج تو نہ ملی البتہ بہت سا بیکار اور بے ضابطہ "انبوہ" مل گیا۔ پس ہم نے بالکل صحیح اور جائز طور پر عہدنامہ کو یہ معنی پہنائے کہ ہم کو کارآمد سپاہیوں کی مقررہ تعداد مہیا کی جانی چاہئے اس لئے ہم غیر مشکوک انصاف

فوج ملنے کا اطمینان کرنے کے لئے ہم یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ایک کثیر تعداد کی فوج حالت امن میں ہمارے زیر نگرانی و زیر ترتیب رہے تو میں جواب دوں گا کہ معاہدہ کی دفعہ ہم کو یہ معنی پہنانے کا کوئی حق نہیں دیتی (میمو آئرز صفحہ ۴۲۶)

ان سرکاری اور نیم سرکاری تحریروں کے بعد کنٹنجنٹ کی اصلیت کے متعلق ایک حرف بھی زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان تسلیم کرتے ہیں کہ کنٹنجنٹ خلاف معاہدہ قائم کی گئی۔ نظام کی اجازت کے بغیر قائم کی گئی اور انہی اغراض کے لئے قائم کی گئی جن کے لئے اس سے پہلے ۶۲ لاکھ کا ملک نظام سے لیکر سب سیڈیری فورس قائم کی گئی تھی۔

کنٹنجنٹ کے مسرفانہ مصارف

آگے چلکر اس کنٹنجنٹ کے مصارف کی خاطر نظام پر جو مصیبتیں نازل کی گئیں ان کو بیان کرنے سے پہلے یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت ۴۰ سال تک اپنے وفادار دوست کے خزانہ سے روپیہ لیکر اس فوج پر کس بے دردی کے ساتھ خرچ کرتی رہی اس کے لئے بھی میں اپنی طرف سے

(بقیہ حاشیہ صہ ۶۲) کے ساتھ ہز ہائی نس سے یہ مطالبہ کرسکتے اور کرتے ہیں کہ وقت ضرورت سے پہلے ہی ایسی تدبیر اختیار کریں کہ ایک باضابطہ فوج فراہم کر رکھیں جس کا خرچ وہ دیں اور افسر ہمارے ہوں اور وہ دکن کے وسطی اضلاع میں قیام امن کا کام دے۔ اس کام کے لئے ہم ۱۵ ہزار کے بجائے صرف ۸ ہزار مانگتے ہیں۔" (میمو آئرز آف فریزر صہ ۳۵۲)

اس اصل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کی سیاست کے خفیہ و علانیہ پہلوؤں میں کس قدر فرق تھا۔

ایک لفظ کہنے کی بجائے خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان کے اعترافات کو نقل کروں گا۔

۲۰ جولائی ۱۸۴۸ء کو کرنل لو (منصرم رزیڈنٹ) نے حکومت نظام کی مالی مشکلات کے متعلق ایک طویل مراسلہ گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا تھا جسمیں اس نے کنٹنجنٹ کے بھاری اخراجات کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

> "یہ خیال کرکے اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ حکومت نظام کی ان شدید مالی مشکلات کا ایک معتدبہ حصہ بالواسطہ خود ہمارے اس چالیس لاکھ روپیہ سالانہ کے مطالبہ کی بدولت اس پر نازل ہوا ہے جو ہم کنٹنجنٹ فورس کے مصارف کے لئے کرتے ہیں۔"
>
> نظام کی کنٹنجنٹ کے متعلق ان تمام واقعات اور حالات کو بیان کرنا در حقیقت میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر میں جب سے یہاں آیا ہوں، میں نے اس حکومت کی مالی پریشانیوں کو اس قدر وسیع وہمہ گیر دیکھا ہے کہ میں گورنر جنرل با جلاس کونسل کے سامنے پیش کرنے کے لئے اپنی رائے صاف صاف ظاہر کردینا ضروری فرض سمجھتا ہوں اور اسی اصول پر میں اس اظہار رائے کے ساتھ اس رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کو اسی ایک رقم تک کم دینے کے لئے جو حد سے حد ۲ لاکھ روپیہ (حالی) سالانہ سے زیادہ نہ ہو، ضروری کارروائی بعجلت ہونی چاہئے۔ کیونکہ پہلے خواہ کچھ صورت رہی ہو، مگر اب مجھے بالکل ظاہر نظر آرہا ہے کہ حیدرآباد کی حکومت وہ بھاری رقم نقد روپے کی صورت میں کسی طرح دینے کے قابل نہیں ہے جو اس فوج کو رکھنے

کے لئے مطلوب ہے میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس پیہم زر پاشی کا سلسلہ مزید تین سال تک بھی جاری رہا تو وہ اس ارا لسلطنت کی مصیبت اور انتشار میں بہت شدید اضافہ کا باعث ہوگا اور غالباً تمام نظم و نسق کے کاروبار کو معطل کر دے گا۔" [1]

اسکے جواب میں ، ۷ / اکتوبر ۱۸۴۲ء کو لارڈ ڈلہوزی کی حکومت نے کرنل لو کو لکھا کہ

"ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل کرنل لو سے اس بات پر متفق ہیں کہ ہم نے کنٹجنٹ کو نظام کے مالیات پر اتنا بھاری بوجھ بنا دیا ہے جتنا اسکو نہ ہونا چاہئے گورنر جنرل باجلاس کونسل کی رائے میں اسٹاف بلا فائدہ زائد ہے اور تنخواہیں، بھتے اور مختلف قسم کے مصارف اس سے بدرجہا زائد ہیں، جتنے ہونے چاہئیں" [1]

۳۰ / مارچ ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لارڈ ڈلہوزی نے دوبارہ اس فضولخرچی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"میں اس اعتراض کے حق بجانب ہونے کو سختی کے ساتھ محسوس کرتا ہوں جو اس فوج کے بھاری خرچ پر کیا جاسکتا ہے۔ . . . . یہ فوج کم نہ زیادہ اکٹھے ۵ بریگیڈیر رکھتی ہے جنکے ساتھ اسی نسبت سے بریگیڈ میجر بھی حالانکہ گوالیار کنٹجنٹ جو ہز ہائی نس (نظام) سے ایک ہزار کم آدمیوں پر مشتمل ہے صرف ایک بریگیڈر رکھتی ہے اور باقی عملہ بھی اسی تناسب سے بہت کم ہے۔" [2]

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۲۵۵

[2] " " ۳۵۲

[3] مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۱ / مارچ ۱۹۲۵ء کو لارڈ ریڈنگ نے اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر کے

(باقی ص ۵۸)

اکتوبر ۱۸۴۸ء میں کرنل لو کے پیہم اصرار پر لارڈ ڈلہوزی نے اس خرچ میں کمی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اس کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

"مزید برآں گورنر جنرل باجلاس کونسل اس بات کے لئے بالکل تیار ہیں کہ فوج کے اسٹاف میں بہت سی گراں خرچ اسامیوں کو تخفیف کردیں اس طرح کہ جب کوئی جگہ خالی ہو یا موقع پیش آئے تو اسکو موقوف کردیں گورنر جنرل باجلاس کونسل نہیں سمجھتے کہ فی الحال اس سے زیادہ کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

اس کے بعد ۱۰ ر ڈسمبر ۱۸۴۹ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے حکومت ہند کو یہ ہدایت کی گئی کہ

"اگر کنٹنجنٹ نظام کے مالیات پر اس سے زیادہ بار ڈالتی ہے جتنا اسکی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے تو نظام کو ایسے غیر ضروری بار سے فوراً نجات دینی چاہئے۔"

۳ ر ڈسمبر ۱۸۵۱ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے پھر لکھا کہ

"کنٹنجنٹ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مصارف کی عام نظرثانی کرکے گورنمنٹ آف انڈیا کو نظام کے سامنے تخفیف مصارف کی ایک مثال پیش کرنی چاہئے جو ان کے مالیات کے لئے اس وقت سخت ضروری ہے۔"[1]

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۳۵۶

(بقیہ حاشیہ ص۵۷) جواب میں جو خط لکھا تھا اسمیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس فضول خرچی کو تسلیم کرلیا جائے تو اسکی ذمہ داری تنہا برٹش گورنمنٹ پر عائد ہو جاتی کیونکہ اس فوج کا سارا انتظام برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھا، اسکی بدانتظامی کی ذمہ داری سے برٹش گورنمنٹ کو سبکدوش قرار دینا صرف سلطنت برطانیہ کے لارڈ چیف جسٹس ہی کا کام ہوسکتا ہے کسی اور کو یہ سعادت حاصل ہونی مشکل ہے۔

لیکن ان بہیم ہدایات اور خود لارڈ ڈلہوزی کے اپنے وعدے کے باوجود ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک کنٹنجنٹ کے خرچ میں جس قدر کمی کی گئی اس کی کیفیت ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو سکتی ہے ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء میں کنٹنجنٹ کی قوت حسب ذیل تھی۔

سال	یورپین افسر	نان کمیشنڈ افسر	سوار	پیدل	توپیں	شاگرد پیشہ	[illegible]
۱۸۴۹ء	۷۹	۹۰	۲۹۱۰	۶۷۳۱	۳۷	۸۸۱	[illegible]
۱۸۵۳ء	۷۹	۸۲	۲۹۱۰	۶۷۳۱	۳۷	۸۸۱	[illegible]

اسی کے متعلق سر ہنری ولاک نے ۱۸۵۹ء میں ایک سخت اختلافی نوٹ لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ

"مذکورہ بالا ہدایات جاری ہونے کے بعد سے نظام کی پریشانیاں بڑھ گئیں اندرونی اضطرابات سے انکے ملک میں انتشار پھیل گیا کنٹنجنٹ کی خدمات ان کو پیش کرنے سے انکار کیا گیا حالانکہ وہ جائز طور پر انکو دیجا سکتی تھیں آمدنی میں مزید کمی ہو گئی۔ کنٹنجنٹ کا بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگا۔ مگر کورٹ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کنٹنجنٹ کے اسٹاف میں اسامیاں خالی ہوئیں اور گورنر جنرل نے ان کو پھر بھر دیا...... حیدرآباد کے رزیڈنٹ بڑے بڑے عالی پایہ افسر جارلس مٹکاف، کرنل اسٹوارٹ، جنرل فریزر اور کرنل لو یکے بعد دیگرے باوقات مختلفہ اظہار کرتے رہے کہ ہم اذروئے معاہدہ

نظام کے خزانے پر اتنے بڑے بڑے مطالبات کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں
اور یہ کہ کنٹنجنٹ کے بارنے بڑی حد تک اس مالی پریشانی کو پیدا کیا ہے جو
اس وقت ریاست کی طاقت کو خطرہ میں مبتلا کئے ہوئے ہے"[1]

لیکن یہ عجیب لطف ہے کہ جو تخفیف ۱۸۴۸ء سے بلکہ صحیح یوں ہے کہ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۵۳ء تک نہ ہو سکتی تھی۔ وہی تخفیف برار لینے کے بعد پہلے ہی سال ممکن ہوگئی اور ممکن بھی اس حد تک کہ جس فوج پر ۳۸ لاکھ روپئے کلدار صرف ہوتے تھے اسی پر ۱۷ لاکھ اور حد سے حد ۲۴ لاکھ روپے سالانہ خرچ ہونے لگے۔ یکم جنوری ۱۸۵۴ء کو جب حیدرآباد کنٹنجنٹ کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو اس کا خرچ ۱۷ لاکھ رکھا گیا تھا اور اسکے بعد کے اخراجات کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہو سکتا ہے

سال	یورپین افسر	نان کمشنڈ افسر	سوار	پیادہ	توپیں	شاگرد پیشہ	خرچ سالانہ
۱۸۵۵ء	۵۰	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۳۴۶۵۳۱۸
۱۸۵۶ء	۴۹	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۳۲۴۴۴۳۴
۱۸۵۷ء	۵۰	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۳۴۰۴۴۲۴

اب یہ بالکل ظاہر ہے کہ جتنی تخفیف معاہدہ برار کے بعد چار سال میں کی گئی اگر اتنی ہی تخفیف معاہدہ سے پہلے چار سال میں کی جاتی تو کنٹنجنٹ کے خرچ میں ۶۰ لاکھ کی کمی ہو جاتی اور بجائے اس کے کہ ۱۸۵۳ء میں حضور نظام پر کمپنی کا ۵۰ لاکھ روپیہ قرض ہوتا۔ خود نظام کے خزانہ میں ۱۰ لاکھ روپیہ الٹا بچ رہتا۔

[1] میمو آئرز صفحہ ۳۵۶

ملک ہضم کرنے کی تدبیریں

اوپر کے بیانات سے یہ معلوم ہو چکا کہ اس کنٹنجنٹ کی ولادت ناجائز طور پر ہوئی تھی۔ اور اسکی پرورش بھی انتہا درجہ کی فضول خرچی کیساتھ کی جاہی تھی جس کا خود انگریزی حکومت کے ارکان کو اعتراف تھا۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ انگریزی ڈپلومیسی کے اس ناجائز بچہ کو کس طرح "یار وفادار" کا ملک غصب کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔

مسلسل تیس پینتیس سال کی بدنظمی اور روز افزوں انحطاط کو دیکھ کر برطانی مدبرین کا دل اس ریاست کو یا کم از کم اس کے زرخیز حصوں کو ہضم کر لینے کے لئے بے اختیار ہو رہا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں لارڈ آکلینڈ نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کرنل اسٹیوارٹ کو جو ہدایات بھیجی تھیں ان میں لکھا تھا کہ کنٹنجنٹ کے قیام و بقا کو سب سے زیادہ اہمیت دو اور ان فوجوں کے مصارف کے لئے چند مخصوص اضلاع کا قبضہ حاصل کرنے کے مناسب مواقع تلاش کرنے میں کوتاہی نہ کرو[۱]

۱۸۳۸ء میں جنرل فریزر کو جو ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا۔ اور اس نے یہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے یہ رائے قائم کی کہ اب یہ لقمۂ تر اتنا نرم ہو چکا ہے کہ اس کو آسانی کے ساتھ نگلا جا سکتا ہے چنانچہ اس نے ۶ر اپریل ۱۸۳۹ء کو لارڈ آکلینڈ کے نام ایک طویل خط لکھا جس کے دوران میں وہ لکھتا ہے کہ

---

[۱] میمو آئرز صفحہ ۸۹

"ازالۂ مرض کے لئے جزوی تدبیریں لاحاصل سمجھتا ہوں اس ملک کی حکومت کا عملاً اپنے ہاتھ میں لے لینے سے کم کوئی چیز میری رائے میں ان خرابیوں کا کافی علاج نہ ہوگی جو یہاں پھیلی ہوئی ہیں [۱]۔"

فریزر کا خیال یہ تھا کہ کمپنی حکومت نظام کو ایک کروڑ روپیہ قرض دے اور اس کے عوض نہ صرف تمام ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے بلکہ عربوں، روہیلوں اور دوسری فوجوں کو بھی منتشر کر دے۔ لیکن اس وقت ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی موقع نہ تھا۔

اس کے بعد فروری ۱۸۴۳ء میں اسسٹنٹ رزیڈنٹ کیپٹن میلکم اور مہاراجہ چندو لال کے درمیان یہ گفت و شنید ہوئی کہ کمپنی سرکار نظام کو ۵۰ لاکھ روپیہ قرض دے اور رائچور، بیڑ یا برار کے علاقوں میں سے کوئی حصہ لے لے [۲]۔ لیکن رزیڈنٹ اور مہاراجہ میں ناچاقی تھی اس لئے یہ معاملہ طے نہ ہو سکا تاہم کمپنی کے ارباب حل و عقد کو اس تجویز سے حالات کا رخ معلوم ہو چکا تھا اسلئے اسی وقت سے آپس میں کھچڑی پکنی شروع ہوگئی کہ دکن کے زرخیز ملک پر کس طرح تصرف حاصل کیا جائے۔ ۳۰ مئی ۱۸۴۳ء کو کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے گورنر جنرل کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا کہ

"اگر اب کوئی مالی مصیبت نظام یا ان کے وزیر کو ہم سے مدد کرنے کی درخواست کرنے پر مجبور کرے تو برٹش گورنمنٹ کی خدمات اس واضح شرط کے ساتھ پیش کی دی

---

[۱] میمو آپیرز صفحہ ۴۴

[۲] " " ۱۷۳

جائیں کہ وہ (یعنی برٹش گورنمنٹ) نظام کی جانب سے ان کے فائدے کی خاطر ملک کا نظم و نسق پورا کا پورا اپنے ہاتھ میں لے لیگی اور اگر ایسی صورت میں ہم نے انکی مملکت کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تو ہز ہائی نس کو صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس وقت واپس نہ کیا جائے گا۔ جب تک ہماری حکومت اس امر کا اطمینان نہ کرے گی کہ نظام یا ان کے جانشین ملک کا عمدہ انتظام کرنے کے لئے مناسب بندوبست کرنیکے قابل پائے جائیں گے"[۱]

دوسری طرف لارڈ ڈالن ہر وکلکتہ میں انہی امور پر غور کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نواب خود اپنے صرف خاص کے خزانہ سے روپیہ دینے پر راضی نہ ہوں گے۔ اور برٹش گورنمنٹ ہی سے مدد طلب کرنا ضروری سمجھیں گے۔ ایسی صورت میں وہ انکی درخواست کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قرض کی ادائیگی کا پورا اطمینان ہو جائے اور اس اطمینان کی واحد صورت اس کے نزدیک یہ تھی کہ نظام کے تمام ممالک محروسہ کو برطانی انتظام میں لے لیا جائے اس غرض کے لیے کلکتہ میں ایک معاہدہ کا مسودہ بھی تیار کر لیا گیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ کمپنی نظام کو ایک ہزار روپیہ قرض دیگی اور اس کے عوض نظام اپنے تمام ممالک محروسہ کا انتظام برٹش رزیڈنٹ یا دوسرے کسی افسر کو جسے برٹش گورنمنٹ منتخب کرے، دیوان کی حیثیت سے سپرد کر دینگے تا آنکہ اصل رقم معہ ۵ فیصدی سود برٹش گورنمنٹ کو واپس نہ مل جائے، اور برٹش گورنمنٹ کو اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ ہز ہائی نس اور ان کے جانشین ان ملک

---

[۱] میمو آئیرز صفحہ ۱۸۸

کا انتظام ایسے طریقہ سے کر سکیں گے کہ پھر اس قسم کی مالی مشکلات پیش نہ آئیں۔ اس تجویزہ معاہدہ کی سب سے زیادہ عجیب دفعہ یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کے انتظام سے ریاست کے مالیات میں جو بچت ہوگی اس کو برٹش گورنمنٹ خود اپنے تصرف میں لائے گی[1]۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست پر برٹش گورنمنٹ کا دوامی قبضہ رہے گا، کیونکہ جب تمام بچت گورنمنٹ لے لیتی، تو ایک کروڑ کا قرض معہ سود ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہتی، اور جب قرض ادا نہ ہوتا تو ریاست کا واگذاشت ہونا معلوم

یہ تھا وہ جال جو یارؔ وفادار" کو پھانسنے کے لئے تیار کیا گیا تھا مگر خوش قسمتی سے جنرل فریزر اور مہاراجہ چندو لال کے باہمی اختلافات بڑھ گئے یہاں تک کہ ۶ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ اپنی خدمت سے علیحدہ ہوگئے اور کمپنی سے قرضہ مانگنے کی نوبت نہ آئی۔ اگرچہ مہاراجہ نے سرکار نظام پر مختلف قسم کے جو قرضے چھوڑے تھے ان سب کو بھگتانے کے لئے ایک سرسری تخمینہ کے مطابق ۲ کروڑ روپیہ درکار تھا[2]۔ لیکن نواب ناصر الدولہ نے اس حوصلہ شکن صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انگریزوں کی طرف استعانت کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ یہی واقعہ ہے جس کے متعلق لارڈ ڈالن بر و بڑے افسوس کے لہجے میں جنرل فریزر کو لکھتا ہے کہ

"میں سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ چندو لال قطعی طور پر عہدہ سے

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۱۸۷

[2] " " ۱۷۸

الگ ہو گئے قبل اس کے کہ ان کی جگہ کسی ایسے آدمی کے تقرر کا انتظام ہو جاتا جسے تم پسند کرتے اور ریاست کے زیادہ بھاری قرضوں کی ادائیگی کا انتظام ہوتا جن میں فوجوں کی تنخواہوں کے بقایا بھی شامل ہیں چندولال محض تمہاری مرضی سے گئے اور مجھے اندیشہ ہے کہ نظام پر ہماری گرفت کا سب سے بڑا ذریعہ بھی گیا۔ اب اس کا بوس سے نجات پا کر نظام ہم کو چٹکیوں میں اڑائیں گے۔ ٹال مٹول کرینگے اور اصلاح کی راہ میں کچھ نہ کریں گے۔"[1]

کنٹنجنٹ کا قرض

پہلے بند کی گرفت کھلتے ہی "یار وفادار" کے لئے دوسرا دام چست کر لیا گیا جس میں آخر وہ پھنس کر رہا۔ گو سرکار انگریزی کو اپنے دوست کا پورا ملک تو ہاتھ نہ آسکا تاہم یہی کیا کچھ کم ہے کہ اس کا ایک تہائی حصہ اور سب سے زیادہ زرخیز حصہ اس کی دوستانہ دست برد سے نہ بچ سکا۔

کنٹنجنٹ کے مصارف کا جو حال تھا وہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ایسے مالی انتشار کے زمانہ میں جبکہ ریاست کے مداخل و مخارج کا توازن ہی درست نہ تھا، اس ۴۲ لاکھ سالانہ کے مستقل مطالبہ کو پورا کرتے رہنے پر ریاست کسی طرح قادر نہ تھی۔ مہاراجہ چندولال پہلے ولیم پامر کی کمپنی سے قرض لیکر اسکو پورا کرتے رہے۔ پھر جب پامر کمپنی ٹوٹ گئی تو ملکی ساہوکاروں کا سہارا ڈھونڈا گیا۔ آخر جب ریاست کی ساکھ بالکل ہی بگڑ گئی تو اس رقم کا ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ اور

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۱۹۴

تنخواہیں بقایا میں رہنے لگیں۔ جولائی ۱۸۴۳ء میں جب مہاراجہ نے استعفےٰ دیدیا تو کنٹیجنٹ کی ٦ مہینے کی تنخواہ بقایا میں تھی۔ جنرل فریزر نے رزیڈنسی کے خزانہ سے یہ روپیہ ادا کیا اور مرکزی حکومت کو اس کے متعلق لکھا وہاں سے جواب آیا کہ جتنے روپیہ کی ضرورت ہو اپنے خزانہ سے دیئے جاؤ اور نظام کو مہلت دیتے رہو۔[1] اس طرح کنٹیجنٹ کے حساب میں نظام کے ذمہ جتنی بقایا نکلتی رہی اسے رزیڈنٹ چپکے چپکے اپنے خزانہ سے ادا کرتا رہا یہاں تک ستمبر ۱۸۴۶ء میں یہ نام نہاد قرض ۳۰ لاکھ کی رقم خطیر تک پہونچ گیا۔

مہاراجہ چندو لال کی علیحدگی کے بعد نواب ناصر الدولہ بہادر نے دیوانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ شعبہ سیاسیات کی نگرانی (جسکا اصلاحی نام اسوقت وکالت تھا) سراج الملک (ابن منیر الملک) کے سپرد کردی تھی۔ اور مہاراجہ چندو لال کے بھتیجے راجہ رام بخش کو پیشکار مقرر کردیا تھا۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ ان بھاری قرضوں میں سے جو مہاراجہ چندو لال چھوڑ گئے تھے، جون ۱۸۴۵ء تک ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ ادا ہو چکا تھا۔[2] نواب کی خواہش تھی کہ بذات خود امور ریاست کی نگرانی کریں۔ مگر یہی وہ چیز تھی جسکو انگریزی حکومت نہیں چاہتی تھی۔ انگریزوں کی خواہش یہ تھی کہ نواب محل سرا میں مشغول عیش و نشاط رہیں اور حکومت کا سارا کام ایک ایسے دیوان کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جو رزیڈنٹ کے زیر اثر ہو۔ انگریزی رزیڈنٹ جنرل فریزر نے اپنی تحریر میں

---

[1] Our Faithful Ally P. 264

[2] میمو آئیرز صفحہ ۲۰۵

اس خواہش کا صاف صاف اظہار بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ۷ مئی ۱۸۴۴ء کے خط میں لارڈ النبرا کو لکھتا ہے کہ

"اس ملک کے اختیارات خود ہمارے ہاتھ میں آتے، اور اس کا انتظام برطانی افسروں کے سپرد کئے جانے سے کم اگر کوئی تدبیر اصلاح میرے خیال میں آتی ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا وزیر مقرر کیا جائے جو برٹش گورنمنٹ کی رائے کے ساتھ (جس کا اظہار یہاں کے رزیڈنٹ کے ذریعہ ہو) حقیقی نہ کہ بناوٹی اشتراک عمل کرے۔"[1]

ان ہی خیالات کی بناء پر برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بار بار زور دیا جا رہا تھا کہ ایک "لائق" دیوان جلد سے جلد مقرر کیا جائے جب ان پیہم تقاضوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو اپریل ۱۸۴۸ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے نظام کو ایک خط لکھا جس میں ریاست کی بدانتظامی پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ اگر ہمارے "دوستانہ نصائح" پر توجہ نہ کی گئی تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ جون ۱۸۴۶ء میں جب ۵ سرکش زمینداروں نے غدر برپا کیا تو حکومت نظام کو کنٹیجنٹ کی خدمات دینے سے انکار کر دیا گیا۔[2] اور رزیڈنٹ نے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنی شروع کیں۔ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ وہ دیوان کے تقرر کے لئے نظام پر سختی کے ساتھ زور ڈالے اور اس کے ساتھ ہی اس قرض کا بھی تقاضا کرے جو کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں ۴۸ لاکھ کی رقم تک پہونچ چکا ہے،

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۲۰۳

[2] میمو آئیرز صفحہ ۲۰۷

اس تجویز کے مطابق ۷ ستمبر ۱۸۴۶ء کو لارڈ ہارڈنگ نے نواب ناصر الدولہ بہادر کے نام ایک اور خط لکھا جس میں دیوان کے تقرر اور قرض کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا تھا اس کے ساتھ ہی رزیڈنٹ کو لکھا گیا کہ نظام پر دباؤ ڈالنے کے لئے جس فوجی مظاہرہ کی ضرورت ہے وہ فی الحال ممکن نہیں ہے کیونکہ مدراس کی فوج ساگر و نربدا میں مشغول ہے۔ بمبئی کی فوج سندھ میں ہے اور بنگال کی فوج لاہور میں رکی ہوئی ہے۔[1]

انگریزی حکومت کے زور دینے پر نظام ایک ایسا مدار المہام کے تقرر پر راضی ہو گئے اور انہوں نے نواب شمس الامرا امیر کبیر کو اس منصب کیلئے منتخب کرنا چاہا لیکن رزیڈنٹ سراج الملک سے بحث و پڑ کر چکا تھا اس نے انہی کے تقرر پر زور دیا اور اعلیٰ حضرت کی ناراضی کے باوجود یہاں تک زور دیا کہ وہ ان ہی کو مقرر کرنے پر مجبور ہو گئے[2]۔ سراج الملک سے اعلیٰحضرت کی ناراضی کسی ذاتی کاوش کی بناء پر نہ تھی بلکہ اس بناء پر تھی کہ انہوں نے اپنے آپکو رزیڈنٹ کے حوالہ کر دیا تھا۔ ۲ نومبر ۱۸۴۶ء کو (عین اس دن جبکہ سراج الملک مدار المہام بنائے گئے) اعلیٰ حضرت نے خود سراج الملک کی موجودگی میں جو گفتگو کی تھی اس کا مفہوم رزیڈنٹ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"بڑے صلاح کاروں نے سراج الملک کی طرف سے ہز ہائی نس کے ذہن کو مسموم کر دیا ہے اور انہیں یہ بات سمجھائی ہے کہ میرا مقصد سراج الملک کے تقرر

---

[1] میموائرز صفحہ ۲۰۹

[2] تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۳۷۰ - صفحہ ۳۷۳

کی تجویز کرنے سے دراصل ان کو یہ موقع دینا ہے کہ آخر کار ملک کو برٹش گورنمنٹ کے سپرد کر دیں۔[۵۱]"

سراج الملک کے مدار المہام ہوتے ہی مطالبہ قرض کے تمام تقاضے بند ہو گئے اور رزیڈنٹ کے مشورے سے کاروبار سلطنت انجام پانے لگے۔ فوجی معاملات کے سلسلہ میں انگریزی مفاد کی سب سے بڑی خدمت جو سراج الملک نے کی وہ یہ تھی کہ ان دیسی فوجوں کو جن کا ایک بڑا حصہ عربوں اور پٹھانوں پر مشتمل تھا جو کلیتہً نظام کے زیر اختیار تھیں اور جن پر کسی خطرے کے وقت نظام اپنی حفاظت کیلئے بھروسہ کر سکتے تھے۔ موقوف کرنا شروع کر دیا۔ رہیو کی جمعیت کے منتشر ہونے کے بعد یہی ایسی فوج رہ گئی تھی جس پر نظام کی ساری جنگی طاقت کا انحصار تھا۔ اور اسی فوج کا وجود انگریزی حکومت کو کھٹک رہا تھا نواب ناصر الدولہ مرحوم کے زمانہ میں اس فوج کی کل تعداد ۳۵ ہزار کے قریب تھی جن میں سے دس ہزار سپاہی خاص دار السلطنت میں موجود رہتے تھے انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ انہیں موقوف کیا جائے یا کم از کم انکی تعداد نصف سے زیادہ گھٹا دی جائے حکومت نظام جب کبھی کنٹیجنٹ کے کثیر اخراجات کے لئے روپیہ بہم پہنچانے سے اپنی معذوری ظاہر کرتی تو جواب میں یہی تجویز پیش کر دی جاتی تھی کہ اس بیکار انبوہ پر جو ۷۳ لاکھ روپیہ سالانہ تم خرچ کرتے ہو اسے بند کرو اور کنٹیجنٹ کے لئے روپیہ دو۔ سراج الملک نے انگریزی حکومت کی اسی خواہش کو اپنے عہد وزارت میں پورا کرنے کی کوشش کی اور سنہ ۱۸۴۲ء میں تقریباً ۱ ہزار فوج کو برطرف کر دیا خود دار السلطنت کی فوج میں سے ۶ ہزار فوج کو انگریزی رسالوں کی مدد سے زبردستی منتشر کیا گیا[۵۲]

میمو آئرز صفحہ ۲۲۲ و ۲۲۳ / ۲۶۱-۲۶۲ ۔ ۵۲ میمو آئرز صفحہ ۲۱۱ ۔ ۵۱

اور اس طرح مرکز حکومت میں خود اپنی فوج صرف ۴ ہزار رہ گئی حالانکہ سکندرآباد سے الوال تک جو انگریزی فوج پڑی ہوئی تھی اسکی تعداد پانچ چھ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔

سراج الملک کی اسی انگریز پرستانہ پالیسی کو دیکھکر نواب ناصر الدولہ بہادر کی ناراضی یہاں تک بڑھ گئی کہ حضور نے انکی باریابی تک بند کردی اور عیدین پر نذرانہ تک پیش کرنے کیلئے ان کو حاضری کا موقع نہ دیا۔[1] ستمبر ۱۸۴۸ء میں اعلیحضرت نے رزیڈنٹ کو بلاکر اپنی اس خواہش کا صاف اظہار کردیا کہ وہ سراج الملک کو مدار المہامی سے الگ کردینا چاہتے ہیں۔ انگریزی حکومت سراج الملک حمایت کا عہد کرچکی تھی اور کرنل لو نے اپنی آنکھ سے کورٹ آف ڈائرکٹرز کا وہ مراسلہ دیکھا تھا جس میں گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سراج الملک کی قطعی تائید کیجائے۔[2] لیکن اس کے باوجود نواب ناصر الدولہ جیسے فرمانروا کے سامنے کھلم کھلا دیوان کی حمایت نہیں کیجاسکتی تھی۔ اس لئے لارڈ ڈلہوزی نے اکتوبر ۱۸۴۸ء میں رزیڈنٹ کو لکھا کہ ہزہائی نس خود مختار ہیں جسکو چاہیں وزیر مقرر کردیں لیکن انہیں صاف طور پر متنبہ کردو کہ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ لارڈ ڈلہوزی کے الفاظ یہ تھے۔

"گورنر جنرل ہزہائی نس کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر وہ اسی روش پر چلتے رہے تو ان کا ملک خوشحال اور پرامن نہ رہیگا اور ایسی صورت میں برٹش گورنمنٹ خود اپنے مقبوضات کے سکون اور اپنی رعیت کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے

---

[1] رشید الدین خانی صفحہ ۳۷۵ — ۷۶

[2] میمو آئیرز صفحہ ۲۵۶

ایک ہمسایہ ریاست میں شورش و اضطراب کے وجود کو گوارا نہ کر سکے گی
خصوصاً جبکہ وہ خود اس کے اپنے مفاد اور سلامتی و اطمینان کے لئے
مضرت رساں ہو۔ ایسے حالات میں برٹش گورنمنٹ غالباً اپنے آپ کو
مجبور پائے گی کہ ہز ہائی نس کی مملکت کے اندرونی انتظام میں قطعی مداخلت
کرے تاکہ اپنی رعیت تک اس مضرت اور تکلیف کو پہنچنے سے روک دے
جو ایک ہمسایہ ریاست کی پراگندہ حالت سے ان پر نازل ہوتی
ضروری ہے۔[1]

یہ تنبیہ نامہ نظام تک پہنچایا گیا مگر انہوں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ جنرل فریزر نے کہا کہ ایسی حالت میں سراج الملک کی علیحدگی گورنر جنرل کی ناراضی کا باعث ہوگی۔ نواب نے جواب دیا کہ اگر گورنر جنرل ناخوش ہوں گے تو بہتر ہے کہ غفراں مآب اور مغفرت مآب کی جگہ پر بھی سراج الملک ہی بٹھائے جائیں۔ آخر کار سراج الملک نومبر ۱۸۴۸ء میں الگ کئے گئے اور انکی جگہ عارضی طور پر امجد الملک مدار المہام بنائے گئے
ادھر سراج الملک ہٹائے گئے، اور ادھر قرض کا تقاضہ شروع ہوگیا، دسمبر ۱۸۴۸ء میں رزیڈنٹ کے نام حکم آیا کہ کنٹیجنٹ کے حساب میں نظام کے ذمہ جو قرض ہے اس کی مقدار اب بہت ہوگئی ہے نظام سے کہو کہ سود برابر ادا کرتے رہیں اور اصل رقم کی ادائیگی کا جلد انتظام کریں۔ نیز کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے ادا کرنے میں

---

[1] میموآئیرز صفحہ ۲۶۶

[2] رشید الدین خانی صفحہ ۳۸۱

[3] پہلے ۱۲ فیصدی کی شرح لگائی گئی تھی۔ ۱۸۴۳ء میں اسے گھٹا کر ۶ فیصدی کر دیا گیا۔

انہیں تساہل کو گوارا نہیں کیا جائے گا۔ آخر میں لکھا تھا کہ :۔

ہز ہائی نس صاف طور پر سمجھ لیں کہ اگر ان مطالبات کو باقاعدگی کے ساتھ پورا نہ کیا گیا تو گورنر جنرل ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرنے پر مجبور ہو جو ان مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی موثر ہوں جن کا اس گورنمنٹ نے ایمانداری کے ساتھ عہد کیا ہے اور خود اس کے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے بھی"[1]

اس دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ نواب ناصر الدولہ نے امجد الملک کی جگہ نواب شمس الامرا امیر کبیر کو مدار المہام مقرر کیا۔ اور شمس الامرا نے کنٹنجنٹ کی تنخواہ ماہ بماہ ادا کرنے کا انتظام کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے رزیڈنٹ کو یقین دلایا کہ وہ قرض کا سود برابر دیتے رہیں گے اور اصل میں سے ۵ لاکھ سالانہ ادا کریں گے جس سے ۱۲ سال میں کل قرض ادا ہو جائے گا۔ لیکن رزیڈنٹ نے اتنی مہلت دینے سے انکار کر دیا۔

شمس الامرا نے جس طریقے سے ملک کا انتظام شروع کیا تھا اس سے امید ہوتی تھی کہ وہ اس عظیم الشان خطرے سے اسکو بچالیں گے جو قضائے مبرم کیطرح اس کے سر پر منڈلا رہا تھا لیکن افسوس کہ دربار کی سازشوں نے اس وفادار خادم دولت کو ۵ مہینے بھی چین سے نہ ٹکنے دیا اور آخر کار مئی ۱۸۴۹ء اس سے استعفے دینا پڑا۔

جون ۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی نے رزیڈنٹ کو لکھا کہ ایک خوشگوار صبح کو نظام اپنے نتائج اعمال کے ہاتھوں جھنجوڑ کر جگائے جائیں گے"۔ ایک اور خط میں اس نے لکھا کہ "مجھے بڑا افسوس ہے کہ نظام خود اپنے ہاتھوں اپنا سر پھوڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۲۹۰

انہوں نے ایسا کرنے کا فیصلہ ہی کرلیا ہے، تو میں اس کا انتظام کروں گا کہ اس گورنمنٹ کے مفاد کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔ اودھ میں انکی شاہی برادری کا ایک دوسرا بھائی اسی روش پر چل رہا ہے، جو نہی کہ لارڈ ہارڈنگ کی دی ہوئی دو سالہ مہلت ختم ہوگی میں کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گا۔ مختصر یہ ہے کہ میرے ہاتھ کچھ عرصہ کے لئے ان مورکھ رئیسوں سے بھرے رہتے نظر آرہے ہیں[۱]

ان دھمکیوں میں جو معنے پوشیدہ تھے وہ کچھ زیادہ عرصہ تک چھپے نہ رہے شمس الامرا کی علیحدگی کے بعد کنٹیجنٹ کی تنخواہیں پھر بقایا میں رہنے لگیں اعلیحضرت نے راجہ رام بخش کو دوبارہ پیش کار مقرر کیا مگر انتظام کے لئے ان سے زیادہ قابل آدمی کی ضرورت تھی۔ آخر ستمبر ۱۸۴۹ء میں نظام کو نوٹس دیدیا گیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۰ء تک تمام قرض ادا کردیا جائے۔ ورنہ برٹش گورنمنٹ جو مناسب سمجھے گی کرے گی۔ لارڈ ڈلہوزی نے صاف کہدیا کہ بحیثیت قرض خواہ اس گورنمنٹ کو نظام پر رحم کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اب وہ انکو ڈھیل نہیں دیگی[۲]۔

قرض کے بدلے ملک کا مطالبہ

ڈلہوزی خود جانتا تھا کہ ۱۵ مہینہ کی مدت میں نظام کے لئے ۶ لاکھ روپیہ کی رقم معہ سود ادا کرنا مشکل ہے خصوصاً جبکہ اسکے ساتھ ہی کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں ۳ لاکھ

---

[۱] میمو آرز صفحہ ۲۹۱، ۲۹۲

[۲] میمو آرز صفحہ ۲۹۹

۲۵ ہزار روپیہ مہینہ کا مستقل خرچ بھی ان کے ساتھ لگا ہوا ہے اس لئے اس نے نوٹس دینے کے بعد ہی نومبر ۱۸۴۹ء میں رزیڈنٹ کو لکھا کہ اب میں نے ایک آخری کارروائی کرنے کا عزم کر لیا ہے لہٰذا تم خفیہ طور سے اپنی رائے بتاؤ کہ قرض کے عوض کفالت میں نظام کے ملک کا کونسا حصہ مانگنا زیادہ مناسب ہوگا۔[لہ] اس کے جواب میں جنرل فریزر نے ۱۹؍ دسمبر ۱۸۴۹ء کو ڈلہوزی کے نام ایک طویل خط لکھا جس کے بعض حصے قابل مطالعہ ہیں۔

"برار پائین گھاٹ تجارتی اور زرعی دونوں حیثیات سے نظام کی مملکت کا سب سے زیادہ زرخیز اور نفع بخش حصہ ہے اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ اس کی مالگزاری کے وصول کرنے میں کوئی دقت پیش آئی ہو میں یقین رکھتا ہوں کہ روئی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی خطہ اس پر فوقیت نہیں رکھتا اور اس چیز کی پیداوار اور برآمد ہمارے انتظام میں اس سے بدرجہا زیادہ ہو جائے گی جتنی اب تک رہی ہے۔"

آگے چل کر فریزر کہتا ہے کہ اس علاقہ کی آمدنی کے متعلق زیادہ تحقیق کرنا مشکل ہے کیونکہ کھود کھود کر پوچھنے سے شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ پھر لکھتا ہے۔

"اگر کل آمدنی صرف ۳۵ لاکھ ہوئی جیسا کہ یہاں فرض کیا جا رہا ہے تو اس کمی کو قریب کا مزید علاقہ لیکر پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسا کرنا ضروری ہی ہوگا جبکہ ہم کنٹینجنٹ کے مصارف کے ساتھ آپا دیسائی کی چوتھ اور مہیپت رام کے خاندان کے سالیانہ کو بھی شامل کر لیں جس کی مجموعی مقدار ۱۲۶۰۰۰

لہ میمور آئرز صفحہ ۳۰۲

تک پہونچتی ہے ۔نیز ۔ ۔ ۳۲۴۰۰۰ سالانہ کے سود کو بھی شامل کرلیں جو نظام کے قرض پر عائد ہوگا۔ اس طرح کنٹیجنٹ کا خسارہ اور یہ رقمیں ملکر تقریباً سات آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ہوجائیں گی۔ اور اس کے لئے مناسب ہوگا کہ ضلع دولت آباد کا ایک حصہ بھی لے لیا جائے۔ اگر نظام اس پر اعتراض کریں کیونکہ غالباً وہ اپنی مملکت کے اس حصہ کو ہمارے انتظام میں دینا پسند نہ کریں گے جس میں اورنگ آباد اور دولت آباد واقع ہیں تو ہم اندیڑ اور کلم کے اضلاع کا بالائی حصہ طلب کرسکتے ہیں کہ وہ بھی کمی کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوگا۔"[1]

۱۸۵۰ء کا ابتدائی زمانہ خاموشی کے ساتھ گذرا کیونکہ سال کے آخر تک کی مہلت دیجا چکی تھی۔ نظام ادائے قرض کے انتظام کے لئے برابر جدوجہد میں مشغول تھے لیکن جب سال ختم ہونے کے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ مدت مقررہ کے اندر قرض ادا نہ کرسکیں گے۔ راجہ رام بخش پیشکار انکی توقعات کو پورا نہ کرسکے قرض کی مقدار ۴۶ لاکھ تک پہنچ گئی اور خزانہ میں کچھ مہیا نہ ہوسکا۔ آخر، ر اکتوبر ۱۸۵۰ء کو اعلیٰحضرت نے انہیں الگ کردیا اور رزیڈنٹ کو بلاکر کہا کہ" راجہ رام بخش نے مجھ سے قطعی وعدہ کیا تھا کہ ۶۰ لاکھ روپیہ مہیا کردینگے مگر ان کا وعدہ غلط نکلا اب مجھے مزید مہلت دو، میں پچاس دن میں ۳۰ لاکھ روپیہ دیدونگا اور اس کے بعد دو سال کے اندر پوری رقم ادا کردونگا"۔ لیکن رزیڈنٹ نے مہلت دینے سے نہ انکار کیا اور نہ اقرار[2]

---

[1] میو آئرز صفحہ ۳۰۵ و ۳۰۶

[2] " " ۳۱۴

۱۶ر دسمبر کو اعلیٰحضرت نے سراج الملک کے ہاتھ پھر پیام بھیجا کہ ہم ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ کے حساب سے قرض ادا کر دیں گے لیکن رزیڈنٹ نے صاف جواب دیا کہ مجھے امید نہیں کہ گورنر جنرل اپنے فیصلہ کو بدل دیں گے ۲۲ر دسمبر کو اعلیٰحضرت نے خود جنرل فریزر کو بلا کر فرمایا کہ میرے پاس اب بھی سوا کروڑ روپیہ کے جواہر موجود ہیں تم برٹش گورنمنٹ کو اطمینان دلا دو کہ اس کا قرض ڈوبے گا نہیں۔ لیکن رزیڈنٹ کا وہی ایک جواب تھا کہ میں آپ کے ارشادات گورنر جنرل تک پہنچا دوں گا مگر مجھے امید نہیں کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدلیں گے۔ اس طرح مدت معینہ گذر گئی اور قرض ادا نہ ہو سکا اس وقت قرض کی تعداد ۷۰ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔

اسی زمانہ میں برار کو جسے ارض موعود سمجھا جا رہا تھا انگریزی تسلط کیلئے تیار کرنے کی تدبیریں شروع کر دی گئیں۔ انگریزی علاقہ سے روہیلوں کی ایک تعداد کثیر اس علاقہ میں گھس آئی اور اس نے وہاں شورش بدامنی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور وہاں کے پُرامن باشندے انکی شرارتوں سے بھاگ بھاگ کر انگریزی علاقہ میں پناہ لینے لگے۔ یہ ملک گیری کیلئے جواز کا پہلو نکالنے کی پرانی تدبیر ہے جو مملکت برطانیہ کی توسیع کیلئے بارہا استعمال کی جا چکی ہے اسکے ساتھ ہی رزیڈنٹ نے جنوری ۱۸۵۱ء میں ملک برار کا پورا نقشہ معہ تعلقہ وار آمدنی کے بنا کر گورنر جنرل کو بھیجا اور لکھا کہ میری رائے میں برار پائین گھاٹ اور برار بالا گھاٹ ہمارے مقاصد کیلئے بہترین اضلاع ہونگے مگر انکے ساتھ ہمیں کار دولت آباد کو بھی شامل کر لینا چاہیے یہی نہیں بلکہ اسی زمانہ میں جنرل فریزر نے ان افسروں کو بھی نامزد کر دیا جنکے سپرد وہ برار کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔

[.] میموآئرز صفحہ ۳۲۶ [.] میموآئرز صفحہ ۳۲۳ [.]

اس وقت نظام کیلئے مالی مشکلات سے زیادہ پریشاں کن یہ چیز تھی کہ وزارت کے لئے کوئی ایسا وفادار آدمی نہ ملتا تھا جو رزیڈنٹ کے اثر سے آزاد رہکر ایمانداری کے ساتھ ان کی خدمت کرسکے۔ فروری ۱۸۵۱ء میں انہوں نے غور و خوض کے بعد گنیش راؤ کو پیشکار بنایا جس کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ رزیڈنٹ کے بجائے خود اعلحضرت کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن سکتا تھا لیکن اسکی نا قابلیت نے رزیڈنٹ کو مخالفت کا اچھا بہانہ دیدیا اور اس نے گنیش راؤ کے ساتھ سرکاری تعلق رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسکی اصلی شکایت یہ تھی کہ نظام نے ایسے شخص کو پیشکار بنایا ہے جو ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح ناچتا ہے حالانکہ اس کو رزیڈنٹ کے ہاتھ میں ناچنا چاہیے فریزر کی رائے میں بہتر تو یہ تھا کہ سارا ملک انگریزی انتظام میں لے لیا جاتا[1] لیکن

۱؎ یہاں اس امر کی تصریح ضروری ہے کہ فریزر ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۲ء کے وسط تک برابر اس بات پر زور دیتا رہا کہ پوری ریاست انگریزی انتظام میں لی جائے لیکن لارڈ الن برو، لارڈ ہارڈنگ، لارڈ ڈلہوزی تینوں گورنر جنرلوں کو اپنے اپنے عہد حکومت میں اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ اس پر عمل کرتے الن برو کے زمانہ میں جب یہ سفارش کی گئی تو اس نے اپنے ۲۷ فروری ۱۸۴۴ء کے خط میں صاف طور پر لکھدیا کہ "آج کل سندھ و ستلج میں فوج کی زیادہ ضرورت ہے چنانچہ چونکہ ہمیں حیدرآباد میں بھی بہت کچھ کرنا ہے مگر میں ایک وقت میں دو کام نہیں کر سکتا جب اس کا وقت آئیگا تو اس کے معاملات کو بھی سلجھایا جائیگا" (میمو آئرز صفحہ ۲۰۲) لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں جب فریزر نے پھر اس مسئلہ کو چھیڑا تو اس نے معذرت کی کہ مدراس بنگال و بمبئی کی فوجیں ساگر نربدا، لاہور اور سندھ میں پھنسی ہوئی ہیں اسلئے کچھ نہیں کیا جا سکتا (میمو آئرز صفحہ ۲۰۹) پھر لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں اس نے متعدد مرتبہ اس تجویز کو پیش کیا ڈلہوزی نے منافقانہ انداز میں جواب دیا کہ ہمارا ایسا کرنا بد عہدی اور پیمان شکنی کا مترادف ہوگا مگر واقعہ یہ ہے کہ

اگر ایسا نہ ہو سکے تو۔

"اس کا واحد بدل، اگرچہ بہت ناکافی ہی سہی، صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دیوان اس صریح مفاہمت کے ساتھ مقرر کیا جائے کہ اگرچہ وہ آخر میں تو اپنے بادشاہ اور ملک کے سامنے جوابدہ ہوگا لیکن حکمرانی میں اس کے اختیارات مطلق ہوں گے اور اسے رزیڈنٹ کی موافقت سے کام کرنا ہوگا۔"[51]

ایک دوسری تحریر میں فریزر نے حیدرآباد کی مدار المہامی کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے۔

"اس ملک کے انتظام میں کوئی ایسا شخص اچھی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا جو ملک کے باشندوں کا اعتماد نہ رکھتا ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ ضروری صفت کی حیثیت سے، جس کو برٹش گورنمنٹ کا اعتماد نہ حاصل ہو۔"[52]

---

[51] میمو آئرز صفحہ ۳۳۱

[52] میمو آئرز صفحہ ۳۳۳

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) پنجاب و صوبہ سرحد کی زبردست فوجی مشکلات نے اسکو اتنی مہلت نہیں دی کہ حیدرآباد کی پوری ریاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا"، ۱۴ اکتوبر ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں وہ خود لکھتا ہے کہ "خواہ واقعات کچھ پیش آئیں جب تک پنجاب میں جنگ ختم نہ ہو جائے اور ملک کے اس حصہ کے معاملات طے نہ ہو جائیں حکومت ہند نہ تو حیدرآباد کی سلطنت میں کسی قسم کی بڑی اصلاحات کا بار اٹھا سکتی ہے اور نہ کسی بڑے سیاسی انقلاب کا انتظام کر سکتی ہے اگر نظام اپنے مصائب کو بڑھانا پسند کرتے ہیں تو وہ خود اپنے راستہ پر چلتے رہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو ابھی ان کی خبر لینے کی فرصت نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ فی الواقع لڑنا ہی چاہیں تو ایسی صورت میں بیشک ہم ان سے بھگتیں گے (میمو آئرز صفحہ ۲۶۵)

رزیڈنٹ اور نظام کے درمیان یہی کشمکش جاری تھی کہ ۶ جولائی ۱۸۵۱ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری کی جانب سے ایک طویل مراسلہ جنرل فریزر کو موصول ہوا جس میں برار پائین گھاٹ اور دوآبہ رائچور کے متعلق اس کی تجاویز پر اظہار پسندیدگی کیا گیا تھا اور گورنر جنرل کی طرف سے اسکو ہدایت کی گئی تھی کہ نظام سے اس ملک کی تفویض کا مطالبہ کرے۔ آگے چلکر اس خط میں لکھا تھا کہ

"اگر نظام تمہاری مقرر کی ہوئی مدت کے اندر گورنمنٹ کے مطالبات کو پورا نہ کریں تو تم ان سے ایک قطعی جواب لینے کے لئے آخری ملاقات کی درخواست کرنا۔ اگر ہز ہائی نس اس موقع پر بھی راضی نہ ہوں یا ایسے انتظامات کرنے سے قاصر رہیں جو مطلوب ہیں تو اس سے تم گورنر جنرل کو مطلع کرنا اس قسم کی اطلاع ملنے پر تمہیں اس امر کے متعلق ہدایات بھیجدیجائینگی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے مبینہ اغراض کے لئے مذکورہ اضلاع پر قبضہ کرلو ان ہدایات کے ملنے کی امید پر تم لکھو کہ آیا تمہیں سبسیڈیری فوج اور کنٹنجنٹ کے علاوہ کچھ اور فوج بھی اس فیصلہ کی تعمیل کیلئے درکار ہوگی؟"

اس کے ساتھ ہی فریزر کو لارڈ ڈلہوزی کا ایک خریطہ بھی ملا جو اعلیٰ حضرت کے نام لکھا گیا تھا۔ خود لارڈ ڈلہوزی کے الفاظ میں اس کا مخاطب ایک پرانا اور گہرا دوست تھا جس کے ساتھ پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے برٹش گورنمنٹ کے "دوستانہ تعلقات" تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس خط میں اسی "یار وفادار" کو اس برٹش گورنمنٹ کے غضب سے ڈرایا گیا تھا جس کی طاقت کا یہ حال

تھا کہ۔

"ہرگاہ خواہد آں عالی شان را پامال ساختہ بے نام ونشاں سازد۔"

ان خشمناک دھمکیوں کے ساتھ دو امور کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں جو قرض ۷۵ لاکھ تک پہنچ چکا ہے اسے ادا کرو۔ دوسرے یہ کہ کنٹیجنٹ کا خرچ باقاعدگی کے ساتھ دو جس کے تم ازروئے معاہدہ پابند ہو[1]۔ ان دونوں اغراض کے لئے نظام پر زور دیا گیا تھا کہ وہ اپنی عرب اور دوسری بیقاعدہ فوج کو برطرف کردیں تاکہ کنٹیجنٹ کی پرورش کیلئے کافی رقم بچ سکے[2]۔

اس خریطہ نے دربار میں ایک کھلبلی مچادی۔ نواب ناصرالدولہ کو ایک طرف گورنر جنرل کی درشت کلامی سے انتہائی رنج پہونچا اور دوسری طرف ریاست کے مستقبل کے متعلق سخت تشویش لاحق ہوئی۔ آخر اس بلا کو ٹالنے کیلئے انہوں نے جون ۱۸۵۱ء کے آخر میں سراج الملک کو از سر نو دیوان بنایا اور ادائے قرض کے لئے شدید جد و جہد شروع کردی جو کچھ خزانہ سے مہیا ہوسکا وہ بہت کم تھا کمی کو پورا کرنے کے لئے نواب نے خود اپنے پاس سے ایک جنبیہ۔ ایک سرپیچ ایک کنٹھی۔ ایک ہار۔ ایک طرہ ایک جوڑ دستبند۔ اور ایک پارہ الماس ناتراشیدہ دیگر اسے رہن رکھا۔ کچھ ریاست کے امراء سے روپیہ لیا اور اسطرح ۱۵ اگست ۱۸۵۱ء کو ۵۴۸۰۴۳۴ کلدار رزیڈنٹ کے حوالے کئے اب صرف

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے خود بارہا اعتراف کیا تھا کہ نظام پر ازروئے معاہدہ کنٹیجنٹ رکھنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

[2] Hyderabad Affairs Vol. II P. 522-528

۲۹۷،۰۲ ۳ روپے باقی رہ گئے تھے جس کے لئے نظام نے ۳۱ اکتوبر تک کی مہلت لی لیکن اس مدت میں اتنی رقم کا انتظام نہ ہو سکا اور ڈسمبر میں صرف ۳۵۴۷،۸ روپے ادا کئے جا سکے۔

۱۸۵۲ء کا آغاز اس طرح ہوا کہ نظام ادائے قرض کے لئے جان توڑ جدوجہد کر رہے تھے اور انگریزی حکومت قرض کے بدلہ میں ملک لینے کی تدبیروں میں منہمک تھی۔ اب انگریزی حکومت کی طرف سے قرض کا تقاضا بہت سست ہو گیا تھا بلکہ اپریل ۱۸۵۲ء میں تو لارڈ ڈلہوزی نے رزیڈنٹ کو لکھ دیا تھا کہ:۔

"کنٹیجنٹ کی تنخواہیں باقاعدہ ادا کرنے کا ضرور انتظام کرو مگر اسوقت کمپنی کے اصل قرضہ کی ادائیگی پر زور دینے سے احتراز کرو۔"[1]

ڈلہوزی کی خواہش یہ تھی کہ نظام کو کافی عرصہ تک قرض کی طرف سے غافل رکھا جائے اور جب قرض اس حد تک پہونچ جائے کہ ادا کرنا ان کیلئے مشکل ہو تو دفعتہً ملک کی تفویض کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء کے اواسط میں اسی پالیسی کے مطابق ملک ہضم کرنے کے نقشے بنتے رہے۔ ڈلہوزی کو پورا احساس تھا کہ موجود الوقت معاہدات سے برٹش گورنمنٹ کو کنٹیجنٹ رکھنے اور اس کا خرچ نظام سے لینے کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے وہ چاہتا تھا کہ نظام سے ایک جدید معاہدہ کیا جائے جس کی رو سے کنٹیجنٹ کو جواز کا جامہ پہنا دیا جائے اور اگر نظام اس پر راضی نہ ہوں تو ان سے زبردستی دستخط حاصل کئے جائیں۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۲ء کو اس نے فریزر کے نام جو خط بھیجا تھا اس میں یہ بیان کرنے کے بعد

---

[1] میموائرز صفحہ ۲۰۴

از روئے معاہدہ کنٹنجنٹ کا وجود جائز نہیں ہے۔ وہ لکھتا کہ

"میرے بیان کردہ وجوہ کی بناء پر ہم کو قطعی طور پر یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ کنٹنجنٹ کو ایک ایسے معاہدہ کے ذریعہ واضح اور محفوظ بنیاد پر قائم کر دیا جائے جو خاص اسی مقصد کے لئے سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کے ضمیمہ کی حیثیت سے طے کیا جائے، کنٹنجنٹ کی مقدار اور اس کے فرائض وغیرہ بصراحت متعین کر دیئے جائیں اور اس کے مصارف کے لئے ایک حصہ ملک برٹش گورنمنٹ کے سپرد کیا جائے۔ یہ علاقہ محض تفویض کیا جائے گا۔ اس کے شاہی حقوق منتقل نہیں کئے جائیں گے اور یہ تفویض اسی بنیاد پر ہوگی جس پر سندھیا نے ۱۸۴۳ء میں گوالیار کا ایک علاقہ کنٹنجنٹ کے لئے تفویض کیا ہے وہ خاص علاقہ جو اس طرح تفویض کیا جائے گا وہی ہوگا جس کو حکومت ہند اس وقت تک اپنے تصرف میں رکھنے کی خواہش ظاہر کر چکی ہے جب تک کہ وہ قرضہ جو اس کے حق میں واجب الادا ہے پورا کا پورا بازیافت نہ ہو جائے حکومت کے حقوق استعمال کرنے کی قوت لامحالہ ہم کو ان اضلاع میں حاصل ہونی چاہئے جو نظام ہمارے سپرد کریں گے۔"

" اس تفویض کردہ علاقہ کی آمدنی انتظام کے اخراجات وضع کرنے کے بعد اس طرح صرف کی جائے گی (۱) کنٹنجنٹ کے مصارف میں (۲) مذکورہ بالا قرض کے سود میں (۳) چھوٹی چھوٹی مدات میں (۴) باقی بچت اگر رہی تو وہ نظام کو ادا کر دی جائیگی۔ اور ان کی اطلاع و طمانیت کیلئے مفوضہ علاقہ کے حسابات سال کے سال حکومت ہند کی طرف سے پیش کئے جائینگے۔"

اگر نظام اتنے غیر معقول ثابت ہوں کہ وہ ان تجاویز کو جو انہی کے مفاد کیلئے پیش کی جارہی ہیں رد کردیں تو یہ مسئلہ اتنا نازک ہوجائیگا کہ ابھی تک اتنا نازک نہیں ہوا ہے۔ سردست ہیں اپنے آپ پر کسی ایسے طریق عمل کے اظہار و اعلان کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا جسے حکومت ہند، اس صورت میں اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ نظام کی جانب سے کنیٹجنٹ کی نامنظوری کو گورنمنٹ منظور کرے گی (خواہ وہ ایک ایسے رئیس کے طرز عمل کے متعلق کیسی ہی رائے رکھتی ہو جس کا رویہ اتنا غیر دیانتدارنہ ہوگا) تب بھی اسوقت اور آئندہ بھی کچھ عرصہ کیلئے کنیٹجنٹ کو رکھنا پڑے گا۔ . . . . نظام کو ہرگز اجازت نہیں دیجا سکتی کہ اس فوج کو کلخت برطرف کردیں اور اس کے سپاہیوں کو ملک پر بے مہار چھوڑ دیں . . . . . .

پس اگر نظام کنیٹجنٹ کے بحال رکھنے کو نامنظور کریں تب بھی اس دوران میں کہ اس کو انجام کار فنا کرنے کی نیت سے رفتہ رفتہ گھٹایا جارہا ہو، اس کے مصارف کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ اس غرض کیلئے بھی ملک کی تفویض اتنی ہی ضروری ناگزیر ہے جتنی دوسری صورت میں ہوسکتی ہے نظام کو ملک دینے پر راضی ہونا چاہیئے۔ اگر وہ انکار کریں گے تو برٹش گورنمنٹ حق و انصاف پر ایسی دست برد کو ہرگز گوارا نہ کرے گی اور بیان کردہ اغراض کے لئے ان علاقوں پر عارضی قبضہ زبردستی حاصل کرلے گی۔" [1]

اس خط کے جواب میں جنرل فریزر نے اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے

---

[1] میموآئرز صفحہ ۳۷۷ تا ۳۷۶

لارڈ ڈلہوزی کو بتایا کہ اس کی تجاویز نظام کے حق میں کیسی ہیں۔ اس نے لکھا کہ :-

"جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس مجوزہ انتظام کا درست اور حق بجانب ہونا ناقابل انکار ہے مگر جہاں تک نظام کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس تجویز میں ان کی یقینی بربادی اور ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے ان کے اقتدار کی کامل موت ہے۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ نظام کو اگر بڑے سے بڑے حالات میں بھی مبتلا کر دیا جائے تب بھی وہ برٹش گورنمنٹ کے قطعی مطالبات یا احکام کی تعمیل میں کوئی مزاحمت کر سکیں گے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہم کو ان سے اس خاموش مقابلہ کی ضرور توقع کرنی چاہئے جو اس شکل میں ہوگا کہ وہ مطلوبہ اضلاع کو ہمیں باقاعدہ تفویض کرنے سے انکار کر دینگے اور اگر ہم ان اضلاع پر قبضہ کر لینا ہی پسند کریں تو وہ ہم کو جو ہمارا جی چاہے کر لینے دیں گے۔"[1]

ایک طرف "یار وفادار" کو "برباد" کرنے اور اس کے ملک پر "زبردستی" قبضہ کرنے کے لئے یہ منصوبے ہو رہے تھے اور دوسری طرف خود "یار وفادار" اپنی عزت اور سلطنت کے بچانے کے لئے آخری جدوجہد کر رہا تھا ۱۸۵۲ء کے آخری زمانہ میں حیدرآباد کے بڑے بڑے ساہوکاروں کی ایک انجمن مسٹر ڈائیٹن۔ ــــ ــــ ــــــــ کے زیر صدارت قائم کی گئی تاکہ متحدہ سرمایہ سے ایک سرکاری بنک کھولے اور حکومت کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کرے

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۳۸۳ و ۳۸۴

نواب ناصر الدولہ بہادر نے اس جماعت سے ۱۲ لاکھ روپیہ قرض لینے کا بندوبست کیا اور کفالت میں نہایت قیمتی جواہر پیش کئے جنہیں مسٹر ڈائیٹن کی حفاظت میں دیدیا گیا۔ اس انتظام کے بعد سراج الملک نے رزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ عنقریب کمپنی کا قرض ادا کر دیا جائیگا۔ اور رزیڈنٹ نے اسکی اطلاع لارڈ ڈلہوزی کو دیدی۔ اگر لارڈ ڈلہوزی ایک "ایماندار ریپلک مین" ہوتا جیسا کہ اس کا دعویٰ تھا تو اسے اس اطلاع کو اطمینان کی نظر سے دیکھنا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس یہ خبر سنتے ہی وہ پریشان ہوگیا اور اس نے فوراً رزیڈنٹ کو لکھا کہ برطانی رعایا کے کسی فرد کی جانب سے کسی دیسی والی ریاست کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز یا گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی گورنر یا جلاس کونسل کی اجازت کے بغیر روپیہ قرض دیا جانا پارلیمنٹ ایکٹ (۳۷ George III ch 142 Sec. 28) کے خلاف ہوگا۔" اس کے ساتھ ہی ڈلہوزی نے رزیڈنٹ کو حکم دیا کہ بلا تاخیر اس کو اطلاع دے کہ یہ بنک کن لوگوں نے کھولا ہے اور کون اس کو چلا رہا ہے؟ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی یورپین ہو تو حیدرآباد کی حکومت کو معاہدہ ۱۸۰۰ء کی دفعہ ۶ کے ماتحت اس سے کوئی کام لینے یا اس کو اپنے حدود مملکت میں رہنے کی اجازت دینے سے روک دیا جائے[۱]

اس حرکت کے معنی بیان کرنا اسکی وضاحت کی توہین کرنا ہے اس میں انگریزی قوم کے سیاسی اخلاق کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ آتنی روشن

---

[۱] میمو آئرز صفحہ ۳۹۰ و ۳۸۹

ہے کہ شرح و بیان کی محتاج نہیں۔ لارڈ ڈلہوزی برار لینے کا عزم کرچکا تھا۔ قرض وصول ہونے یا نہ ہونے، کنٹیجنٹ کے قائم رہنے یا نہ رہنے کی اس کو پرواہ نہ تھی اسے بہر حال برار لینا تھا اس لئے جو کوئی اس کی اس خواہش میں مزاحم ہوتا ہے قدرتی طور پر ایسا ہی مجرم ہونا چاہئے تھا کہ حیدرآباد میں کاروبار کرنا کیا معنی نظام کے ممالک محروسہ میں بھی اس کے خطرناک وجود کو نہ رہنے دیا جاتا۔ چنانچہ مسٹر ڈائیٹن کو بہت جلدی حیدرآباد سے نکال دیا گیا۔ اور چونکہ وہ بھی لارڈ ڈلہوزی کے ہم قوم تھے اس لئے ان کا بھی کم از کم اتنا فرض ضرور تھا کہ چلتے چلتے وہ جواہرات بھی لے جاتے جو مجوزہ قرض کی کفالت میں حضور نظام نے دیئے تھے ان جواہرات کو بعد میں سرسالار جنگ مرحوم نے بڑی کوشش سے حاصل کیا جبکہ قریب تھا کہ وہ ہالینڈ میں بیچ دیئے جاتے۔[1]

اس طرح جب روپیہ حاصل کرنے کی تمام تدبیروں میں ناکامی ہوئی اور شاہی خزانہ کے بیش قیمت جواہر کا ایک بڑا حصہ قبضہ سے نکل گیا۔ تو نظام بالکل بے بس ہو گئے۔ ان کی سلطنت کی مالی حالت اس وقت حد سے زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ وسائل ثروت تقریباً سب کے سب ۵۰ سال کی مسلسل بدنظمی اور فضول خرچی کی نذر ہو چکے تھے آمد و خرچ کے عدم توازن کا یہ حال تھا کہ ۲۷ لاکھ روپیہ کا سالانہ پیہم گھاٹا آرہا تھا۔ صرف فوج کا خرچ ایک کروڑ سالانہ سے زائد تھا حالانکہ ریاست کی کل آمدنی نظم و نسق کے مصارف کو وضع کر کے صرف ایک کروڑ ۲۲ لاکھ تھی ایسی حالت میں ریاست کے خزانہ سے ۵۰ لاکھ

---

[1] میمو آئوز صفحہ ۳۹۲

ادا کرنا اور پھر ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ بھی ادا کرتے رہنا ناممکن تھا اب دوسری صورت صرف یہ رہ گئی تھی کہ اس خاندانی دولت کو نکالا جاتا جو نظام کے بزرگوں نے ڈیڑھ صدی کے اندر جمع کی تھی سو انگریز دوستوں کی بدولت اس خاندانی دولت کا بھی ایک معتدبہ حصہ ہاتھ سے نکل گیا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی چھن گئے۔ یہی بے بسی کی حالت تھی جس میں نظام کو تفویض برار کے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا گیا جو کرنل ڈیوڈسن اسسٹنٹ رزیڈنٹ کے الفاظ میں دھمکیوں اور بھبکیوں کا نتیجہ تھا۔

قرض کی اصلیت

تفویض برار کا معاہدہ جس طرح ہوا اس کی کیفیت بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ قرض جس کی خاطر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اسکی اصلیت کیا تھی، اور قانوناً، عرفاً، اخلاقاً وہ کہاں تک نظام کے ذمہ واجب الادا ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے ذیل کے امور خاص طور پر قابل غور ہیں۔

(۱) کنٹنجنٹ قائم کرنے کے لئے نظام کی باضابطہ منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی اور محض پیشکار سے معاملہ طے کرکے اس کو نظام کے سر چپکا دیا گیا تھا۔ یہ فعل نہ صرف قانوناً ناجائز تھا بلکہ سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۵ کے بھی خلاف تھا جسمیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہز ہائی نس کی اولاد عزیز و اقارب رعایا اور ملازموں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گی[1]" اس معاہدہ کی رو سے

[1] Aitchison Vol. IX P. 72

کمپنی کی حکومت کو کوئی حق نہ تھا کہ نظام کی اجازت کے بغیر بالا بالا پیشکار سے ایک ایسا معاملہ طے کر لیتی جس سے سلطنت کے خزانہ پر ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ کا ناقابل برداشت بار پڑتا تھا۔

(۲) کنٹیجنٹ باوجودیکہ نظام کے خرچ پر رکھی گئی تھی مگر اس کے انتظام میں نظام کو کوئی دخل دینے کی اجازت نہ تھی خود کمپنی کے ذمہ دار افسروں نے حتیٰ کہ خود گورنر جنرل نے تسلیم کیا کہ کنٹیجنٹ کے مصارف حد سے زیادہ ہیں لیکن جب تک اس کا خرچ نظام کے خزانہ سے وصول ہوتا رہا اس وقت تک اس میں ایک پیسہ کی کمی نہیں کی گئی۔ اگر کمپنی تفویض برار کے معاہدہ سے صرف ۴ سال پہلے ہی کنٹیجنٹ کے مصارف میں اتنی تخفیف کر دیتی جتنی کہ معاہدہ کے بعد چار سال کے اندر اس نے کی تو ۱۸۵۳ء میں نظام کے ذمہ کمپنی کا ایک پیسہ قرض نہ ہوتا بلکہ نظام کے خزانہ میں الٹے دس لاکھ روپیہ بچ رہتے۔

(۳) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۲ کی رو سے نظام نے صرف یہ عہد کیا تھا کہ کسی تیسری طاقت سے جنگ چھڑنے کی صورت میں وہ ۱۵ ہزار سپاہیوں سے انگریزی حکومت کی مدد کریں گے۔ اس کا یہ ہرگز منشا نہ تھا کہ وہ اپنے خرچ سے انگریزوں کی مدد کے لئے خود انگریزوں کی نگرانی میں ۹ ہزار فوج ہمیشہ رکھیں گے۔ خواہ جنگ ہو یا نہو۔ خود لارڈ ڈلہوزی کے اقرار کے مطابق ۳۵ سال تک انگریزی حکومت کو ایسی کوئی جنگی ضرورت پیش نہیں آئی جس کیلئے نظام سے مدد طلب کیجاتی[1]۔ پس اس لحاظ سے نظام کو خواہ مخواہ ۳۵ سال تک ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ

---

[1] میموآئرز صفحہ ۴۲۵

(یعنی کل ۴۱ کروڑ ۷۰ لاکھ) ادا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ حالانکہ معاہدہ کی رُو سے ان پر یہ روپیہ دینے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے نظام نے ۶۲ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا ملک (جو میسور کی دو لڑائیوں میں ان کے ہاتھ آیا تھا) کمپنی کو اس غرض سے دیا تھا کہ وہ ان کی امداد کے لئے فوج رکھے۔ جس کا خرچ اس وقت ۴۲ لاکھ سالانہ تھا، اس امدادی فوج کا از روئے معاہدہ یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ

"اگر مستقبل میں شوراپور یا گدوال کے زمیندار یا ہز ہائی نس کی حکومت کے دوسرے وابستگان توابع Subjects or Dependants سرکار کے جائز مطالبات کو جو ان پر ہوں ادا نہ کریں یا بغاوت کی آگ بھڑکائیں یا شورش پھیلائیں تو جمعیت تغلبندی (Subsidiary Force) یا اس کا اتنا حصہ جو ضروری ہو جرم کی حقیقت پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد ہز ہائی نس کی اپنی افواج کی معیت میں ایسے تمام مجرموں کو اطاعت پر مجبور کرنے کیلئے جانے پر تیار ہوگی۔

اس دفعہ کی رو سے سرکار نظام اس امر کا پورا حق رکھتی تھی کہ اسکی رعایا میں سے جب کبھی کوئی سرکشی کرے تو وہ جمعیت تغلبندی کی خدمات کمپنی سے حاصل کرے۔ لیکن کمپنی چونکہ اس فوج کا خرچ مع تشے زائد نظام سے وصول کر چکی تھی اس لئے اس نئے شورشوں اور سرکشوں کو فرو کرنے کے لئے اسکی

خدمات دینے سے ہمیشہ انکار کیا اور ان ہی فرائض کو جو جمعیت تغلبندی پر از روئے معاہدہ عاید ہوتے تھے کنٹنجنٹ پر ڈالدیا کیوں کہ اس کے مصارف کا بار خود نظام کے خزانہ پر پڑتا تھا۔ ۴۵ سال کی مدت میں حیدرآباد کنٹنجنٹ نے نظام سرکار کی جتنی خدمات انجام دیں وہ سب کی سب ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے خود کمپنی کی جمعیت تغلبندی کو انجام دینی چاہئے تھیں اس لئے حکومت نظام سے ان کا معاوضہ وصول کرنا جبکہ معاوضہ پہلے ہی ۶۲ لاکھ کے ملک کی صورت میں دیا جا چکا تھا سراسر ناجائز تھا۔

(۵) جمعیت تغلبندی کے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے خود نظام کے خرچ پر کنٹنجنٹ رکھ کر انگریزی حکومت نے یہ فائدہ اٹھایا کہ جمعیت تغلبندی کے مصارف میں بہت کمی ہو گئی صرف یہی نہیں کہ فوجی خدمات ادا کرنے میں جو خرچ ہوتا وہ بچ رہا، بلکہ حکومت نے فوج کی تعداد کو بھی اس سے کم کر دیا جتنی از روئے معاہدہ اس کو رکھنی چاہئے تھی۔ خود کورٹ آف ڈائرکٹرز میں میجر مور نے جو بیان ۷، نومبر ۱۸۵۳ء کو دیا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ۔

"ہم نے اپنی امدادی فوج کی رجمنٹوں کی عددی قوت کو بیدل فوج میں ایک ہزار بندوق برداروں سے گھٹا کر ۷۰۰ کر دیا اور سوار فوج میں ۵۰۰ شمشیر زنوں سے کم کر کے ۴۲۰ کر دیا ہے[۱]۔ اور اس طرح گذشتہ

---

[۱] ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے طے ہوا تھا کہ ۸ ہزار سپاہیوں کی آٹھ پلٹنیں اور ایک ہزار

۳۰ سال سے حیدرآباد کے علاقہ میں ہم نے جو فوج رکھی ہے وہ اس تعداد سے بقدر زائد از یک ربع کم ہے جس کے رکھنے کا ہم نے عہد کیا تھا اور جس کا خرچ بھی ہم پیشگی وصول کر چکے تھے۔ ہم نے اپنے عہد و پیماں میں یہ کوتاہی کس بناء پر کی؟ ہم کو اس فوج کا خرچ وصول کرنے کا کیا حق تھا جو در اصل ہم نے نہیں رکھی؟ اگر اوپر کے واقعات درست ہیں تو آیا ہم اس پر مجبور ہیں یا نہیں کہ ہم نے جو کچھ نظام سے وصول کیا ہے اور جس کا بدل ان کو نہیں دیا ہے اس کا حساب نظام کو دیں"[1]

پس انصاف یہ چاہتا ہے کہ ۳۰ سال تک ۲۱۶۰ سپاہیوں کی کمی سے انگریزی حکومت جو روپیہ بچاتی رہی وہ نظام کو واپس دیتی۔ کم از کم اندازہ کے مطابق یہ رقم دو کروڑ روپیہ سے کم نہ تھی اور اس حساب سے ۱۸۵۳ء میں بجائے اس کے کہ کمپنی حضور نظام سے ۴۳ لاکھ روپیہ کے قرض کا مطالبہ کرتی۔ حضور نظام کو اس قرض کی رقم وضع کر کے کمپنی سے ۱۵۷ لاکھ کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔

(۶) سنہ ۱۸۱۲ء سے سنہ ۱۸۵۳ء تک کمپنی ناجائز طور پر جالنہ اور سکندرآباد میں حضور نظام کی رعایا سے آبکاری کے محاصل وصول کرتی رہی ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء

---

[1] میمو آرز صفحہ ۳۶۱ تا ۹

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰) سواروں کی دو رجمنٹیں رکھی جائیں گی مگر میجر مور کے بتائے ہوئے حساب کے مطابق کمپنی نے سپاہیوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے گھٹا کر ۶ ہزار کر دی اور سواروں کی تعداد ایک ہزار سے گھٹا کر ۸۴۰۔ (دیکھو ایچی سن جلد ۹ صفحہ ۸۰ و ۹۹)۔

میں سرکار نظام نے اس پر اعتراض کیا اور اپریل ۱۸۵۲ء میں خود نواب شمس الدولہ بہادر نے اس مد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس مد کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی اور ۴۱ سال سے وصول کی جا رہی تھی۔ اگر اس کا سود نہ لگایا جاتا، تب بھی ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے ذمہ سرکار نظام کا ۴۱ لاکھ روپیہ واجب الادا تھا۔

یہی امور ہیں جن کی بنا پر انگریزی رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نے اپنے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے مراسلہ میں صاف لکھدیا تھا کہ

"میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ اگر دونوں حکومتوں کے مالی مطالبات کی غیر جانبداری کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے تو ہم ۴۳ لاکھ روپیہ (کلدار) کے موجودہ قرض کا کوئی جائز دعویٰ نظام پر نہیں کر سکتے جس وقت ہز ہائی نس کے مدار المہام پر کنٹیجنٹ کے بقایا کا تقاضا کیا گیا تھا اس نے ۹ اگست ۱۸۵۱ء کو اپنے ایک نوٹ میں سکندرآباد اور جالنہ کی آبکاری کے محاصل میں سے فاضل باقیات کا مطالبہ کیا تھا۔ ہم اس آمدنی کو جو ایک لاکھ سالانہ تک پہونچتی ہے، ۱۸۱۲ء سے ۱۸۵۳ء تک یعنی ۴۱ سال تک اپنے حساب میں وصول کرتے رہے حالانکہ یہ رقم بغیر کسی سود کے ہمارے مطلوبہ قرضہ میں سے ۴۱ لاکھ روپیہ نظام کے حساب میں جمع کر دیتی ...... مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہو جانی چاہیئے کہ ۱۸۵۳ء میں ہم نظام پر کوئی جائز مالی مطالبہ نہیں رکھتے تھے یا اگر رکھتے بھی

تھے تو بہت کم ہیں۔[۱]

یہ ہے اس قرض کی حقیقت جس کے لئے نظام پر اس قدر سخت تقاضے کئے جارہے تھے جس کے لئے نظام کی "دیانتداری" معرض بحث میں لائی جارہی تھی اور جس کے لئے لارڈ ڈلہوزی انگریزی حکومت کے "حقوق" اور "مفاد" کی حفاظت کرنے پر اس قدر مستعدی کے ساتھ آمادگی ظاہر کررہا تھا۔ بنیئے مہاجن تو اپنے قرضداروں پر صرف اتنا ہی ظلم کرتے ہیں کہ اپنی بہی میں سود در سود لگاکر فرضی حساب بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لئے انہیں پہلے عدالت میں جانا پڑتا ہے۔ پھر اُسے قانوناً جائز ثابت کرکے ڈگری حاصل کرنی پڑتی ہے۔ پھر قرق امین کی خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے نظام کو جس قرض خواہ سے واسطہ پڑا تھا وہ بیک وقت مہاجن بھی تھا منصف بھی تھا اور قرق امین بھی اس نے پہلے خود ہی حساب بنایا، پھر اپنے ہی حق میں ڈگری بھی دے لی۔ اور اس کے بعد خود ہی قرقی کا وارنٹ بھی لے آیا۔ ایسے داؤں کے مقابلہ میں بیچارے مدیون کے لئے اپنی جائداد ضبط کرادینے کے سوا اور کیا چارہ کار باقی رہ سکتا ہے۔

تفویض برار

آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ ضبطی جائداد کی کارروائی کس طرح عمل میں آئی

---

[۱] میموآئرز صفحہ ۳۶۵

مارچ ۱۸۵۳ء میں کرنل لو رزیڈنٹ بناکر حیدرآباد بھیجا گیا۔ ۲۰ اپریل کو اسے نظام کے ساتھ ایک جدید معاہدہ کی گفت وشنید کے لئے خاص ہدایات وصول ہوئیں اور اس کے ساتھ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ بھی پہنچا۔ جس میں کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے لئے ۳۶ لاکھ روپیہ سالانہ کا ملک دوامًا برٹش گورنمنٹ کو تفویض کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ کرنل لو نے یہ مسودہ سراج الملک کو دکھایا تو انہوں نے اپنے آقا کے حق نمک کو فراموش کرکے اور خود اپنے وطن کی عزت کو بھلاکر جواب دیا کہ "ریاست کے معاملات اس وقت اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کو اپنے تئیں خوش قسمت سمجھنا چاہئے کہ انہیں ایسا معاہدہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ایک بچہ بھی اگر وہ تعصب اور غلط صلاح کاروں کے اثر سے پاک ہو تو وہ دیکھ لے گا کہ مجوزہ معاہدہ کو قبول کرنے میں نظام اور ان کی حکومت کے لئے بڑی اور واضح منفعت ہے۔" اس کے بعد جب یہی مسودہ نواب ناصر الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے سنتے ہی انہوں نے فرمایا کہ "خدا نہ کرے مجھے یہ ذلت سہنی پڑے"۔[۱] اس کے بعد اعلیٰ حضرت مغفرت منزل نے ایک تقریر کی جس کے بعض بعض حصے کرنل لو نے اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں نقل کئے ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں ان کے جذبات کیا تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ

"ہاں پہلے بھی تم مجھ سے کہہ چکے ہو کہ تم ایک نیا عہدنامہ تجویز کرنے والے ہو۔ مگر تم نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میرے سامنے اس قسم کا

۱؎ دیکھو کرنل لو کا مراسلہ مورخہ ۳ مئی ۱۸۵۳ء نمبر (۷۰)

معاہدہ پیش کیا جانے والا ہے، تم نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ تم مجھ سے میری مملکت کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کی درخواست کرنا چاہتے ہو۔ کیا میں نے کبھی انگریزی حکومت سے جنگ کی ہے؟ یا اس کے خلاف سازش کی ہے؟ یا اس کا ساتھ دیتے رہنے اور اس کی خواہشات کی پیروی کرتے رہنے کے سوا کچھ اور کیا ہے کہ آج میری یہ تذلیل کی جا رہی ہے؟"

کرنل لو نے جواب دیا کہ اس معاہدہ میں آپ کی تذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس پر مغفرت منزل نے فرمایا۔

"ایک بادشاہ کے لئے دو فعل ہمیشہ ذلت آمیز سمجھے جاتے ہیں ایک اپنے آبائی ملک کا کوئی حصہ چھوڑ دینا اور دوسرے اپنی بہادر اور کار آزمودہ فوج کو برطرف کر دینا۔ تم جیسے اصحاب کہ کبھی فرنگستان میں ہوتے ہو تو کبھی ہندوستان میں، کبھی امور سلطنت میں حصہ لیتے ہو تو کبھی سپاہی بن جاتے ہو، کبھی ملاحی کا پیشہ اختیار کرتے ہو تو کبھی بازرگانی کا (میں نے سنا ہے کہ تمہارے گروہ میں سے بعض بڑے آدمی سوداگر بھی رہے ہیں) تم اس معاملہ میں میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ میں ایک خاندانی رئیس ہوں اسی سلطنت میں جو سات پشت سے میرے خاندان میں چلی آ رہی ہے جینے اور مرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اپنی اس سلطنت کا ایک حصہ دو آنا تمہاری حکومت میں دے کر خوش

رہ سکتا ہوں ؟ اس پر خوش ہونا بالکل ناممکن ہے۔ مجھے اس کو اپنی ذلت سمجھنا چاہئے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے گروہ کے کوئی صاحب یہ خیال رکھتے ہیں کہ اگر مجھے بھی غوث خاں (نواب ارکاٹ) کی حالت میں رکھا جائے تو میں خوش اور مطمئن رہوں گا یعنی مجھے کسی پرانے ملازم کی طرح ایک وظیفہ دے دیا جائے اور میں کھانے، سونے اور نماز پڑھنے کے سوا کسی کام سے واسطہ نہ رکھوں۔ مگر (یہاں اعلیحضرت نے ایک عربی کا مقولہ نقل کیا ہے جسے کرنل لو نہیں سمجھ سکا)۔ ۔ ۔ ۔ خیر تم میرے شاہانہ احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم کہتے ہو کہ یہ معاہدہ کرنے سے مجھے ۸ لاکھ روپیہ کی بچت ہو جائے گی اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر ۸ لاکھ سے چہار چند بھی بچت ہو تب بھی میں مطمئن نہ ہوں گا کیوں کہ میں اپنا ملک چھوڑ کر اپنی عزت کھو دوں گا۔"[1]

اس کے بعد نواب مرحوم نے رزیڈنٹ کو رام کرنے کی کوشش کی اور اس سے کہا کہ اگر محض کنٹیجنٹ اور پچھلے قرض کی خاطر یہ ملک مانگا جا رہا ہے تو میں چار مہینے کے اندر اندر قرض ادا کر دوں گا اور آئندہ کے لئے ماہ بماہ تنخواہیں ادا کرنے کا انتظام ہو جائے گا۔ مگر وہاں ملک لینے کا

---

[1] Hyderabad affairs Vol. „ P. 599, 601

فیصلہ ہو چکا تھا اس لئے رزیڈنٹ نے اس وعدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اعلیحضرت نے کہا کہ۔

"فرض کرو اگر میں یہ کہوں کہ کنٹجنٹ ہی کو نہیں چاہتا تب تم کیا کرو گے۔"

کرنل لو نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں ہم کنٹجنٹ کی برطرفی کو قبول کرلیں گے مگر اسے یکلخت برطرف نہیں کیا جائے گا بلکہ رفتہ رفتہ کیا جائے گا۔ جس میں کئی سال لگیں گے۔ اور اتنی مدت کے لئے پھر بھی ہم کو ان کی تنخواہوں کے لئے ان اضلاع کی ضرورت پڑے گی جو ہم مانگ رہے ہیں[1]۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خواہ کنٹجنٹ رہے یا نہ رہے دونوں حالتوں میں ملک نہ چھوڑا جائے گا۔ پھر اعلیٰ حضرت نے یہ تجویز پیش کی کہ ملک برار شمس الامراء امیر کبیر کے سپرد کیا جائے اور وہ قرض اور کنٹجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے کا انتظام کریں مگر رزیڈنٹ نے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ برار کا علاقہ رزیڈنٹ اور شمس الامراء دونوں کے انتظام میں دیا جائے یہ دوعملی کی صورت ناقابل قبول تھی[2] اس کے بعد رزیڈنٹ نے ۱۴ مئی کو گفت وشنید کا سلسلہ بند کر دیا اور اور مطالبہ کیا کہ "ہاں" یا "نہیں" کا آخری جواب دیدیا جائے۔ پھر

---

[1] Hyderabad affairs Vol. II. P. 607

[2] رشید الدین خانی ۱۴۶۔ کرنل لو نے بھی اپنے ۱۳ مئی ۱۸۵۳ء نمبر ۷ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۹ مئی کو کرنل ڈیوڈسن (اسسٹنٹ رزیڈنٹ) نے سراج الملک کے نام ایک خط بھیجا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"میرے عزیز نواب۔ مجھے یقین ہے کہ رزیڈنٹ آج شام کو آپ سے ملاقات کرنے کی خواہش کریں گے۔ تاکہ آپ کو اطلاع دیں کہ نظام سے ان کی گفت وشنید اب ختم ہوتی ہے اور آج کی ڈاک سے وہ گورنر جنرل سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ فوجوں کو حرکت دیں ہزہائی نس نے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی۔ مگر اس مدت میں بھی یقینی طور پر فوجوں کی تنخواہیں ادا کرنے کی شرط نہیں کی تھی۔ اس لئے اسے نامنظور کیا گیا۔ تاہم اگر وہ ایسا کرتے تب بھی اسے نامنظور کیا جاتا۔ کیوں کہ یہ گورنر جنرل کی ہدایات کے خلاف تھا۔

"ہزہائی نس نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ ۴۰ لاکھ کا ملک کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے شمس الامرا کے ہاتھ میں دیدیں۔ اس پر رزیڈنٹ نے کہا کہ "نہیں" کیوں کہ ان کو اس امر کا یقین نہیں دلایا جا سکتا کہ ہزہائی نس کی حکومت، یا ان کے افسروں کی طرف سے اس میں کوئی مداخلت نہیں کیجائیگی۔ لیکن اگر یہ تعلقے رزیڈنٹ اور شمس الامرا یا حیدرآباد کی حکومت کے کسی دوسرے افسر کو کمشنر بنا کر سپرد کر بھی دیئے جاتے (اس طرح کہ انہی کو ان اضلاع کا پورا انتظام اور اختیار دیدیا جاتا اور وہ صرف ہزہائی نس کو

سالانہ حساب دینے کے ذمہ دار ہوتے) تب بھی رزیڈنٹ صرف یہ کر سکتے تھے کہ ان تجاویز کو کلکتہ بھیجدیتے۔ باقی اسکی ذرہ برابر امید نہیں تھی کہ گورنر جنرل اس کو منظور کرلیں گے

"ہز ہائی نس نے مذکورۂ بالا تجویز (یعنی شمس الامرا اور رزیڈنٹ کی دو عملی) کو بھی قبول نہیں کیا ہے اس لئے انہوں نے اس چیز سے نجات حاصل کرنے کا آخری موقع بھی کھو دیا جو ان کے احساس وقار تمکنت کے منافی تھی اب وہی تجاویز جو پہلے پیش کی گئی تھیں۔ پھر پیش کی جاتی ہیں اور ایسے غیر دوستانہ جذبات کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ جو میری رائے میں معاملات کو انتہائی حدود تک پہنچادیں گے۔ فی الحقیقت میرے پاس پونا سے میرے بھتیجے کا خط آیا ہے جس میں اطلاع دیگئی ہے کہ ۸۰ بائی لینڈرز اور ہز مجسٹی کی رجمنٹ نمبر ۸۶ کو حیدرآباد پر چڑھائی کے لئے تیار رہنے کے احکام پہنچ گئے ہیں۔ یہ مت فرض کرلیجئے کہ فوجی کارروائی صرف اضلاع (برار) تک محدود رہے گی۔ اگر آپ ہز ہائی نس کے دوست ہیں تو ان سے التجا کیجئے کہ اپنی ذات اور اپنی عزت کو بچانے کے لئے گورنر جنرل یقیناً ان کو مجبور کردیں گے۔"[1]

کوتھ، ڈیوڈسن

---

[1] میموآئرز صفحہ ۱۴۲

یہ فوجی حملہ کی دھمکی کسی دشمن کو نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ ایک دوست کو دی گئی تھی۔ اور دوست بھی وہ وفادار دوست جس نے ابتدائے قیام سلطنت برطانیہ سے آج تک کبھی اس سلطنت کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔ جو ۱۷۹۵ء سے لیکر آجتک ہر موقع پر اس سلطنت کا ساتھ دیتا رہا اور جس نے ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے خلاف اس سلطنت کی مدد کرکے اس کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط کیں مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا جبکہ نظام الملک کی نگاہِ لطف کے بغیر مدراس میں فرانسیسیوں سے جان بچانی مشکل تھی، نہ وہ زمانہ رہا تھا جبکہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی تلوار سے بچنے کے لئے آصف جاہ کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ زمانہ باقی رہا تھا جبکہ مرہٹوں کی خطرناک طاقت کو مٹانے کے لئے یار وفادار کی مدد درکار تھی، اب وہ تمام نازک زمانے گذر چکے تھے اور انگریزی سلطنت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ دوستوں کی دوستی اس کے لئے کچھ زیادہ قیمتی نہ رہی تھی اس لئے پرانا آئینِ وفاداری بدل گیا۔ مہر و محبت کی رسم کہن ختم ہو گئی اور دشمن کو دشمنی کی پاداش میں نہیں بلکہ دوست کو دوستی کے جرم میں وہ بدلہ دیا گیا جو شرفا دشمنوں کو بھی کم دیتے ہیں۔

نواب ناصر الدولہ حیدرآباد پر فوج کی چڑھائی کے معنی سمجھتے تھے مقاومت بے سود تھی، عربوں، روہیلوں اور دوسری جنگجو قوموں کی بے قاعدہ فوج اگر لڑتی بھی تو کمپنی کی باقاعدہ فوج کے سامنے چند

گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹھیر سکتی تھی۔ اس کے بعد پوری ریاست پر قبضہ کیا جاتا اور نظام الملک آصفجاہ کے خاندان کے ساتھ بھی خاکم بدہن وہی سلوک کیا جاتا جو اورنگ زیب عالمگیر کے خاندان کے ساتھ دہلی میں کیا گیا۔ لہذا کرنل ڈیوڈسن کے خط کا جواب وہی ہو سکتا تھا جو دیا گیا یعنی دوسرے ہی سرلج الملک نے رزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ اعلیٰ حضرت معاہدہ کو منظور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۸۵۳ء کو کرنل لو خوش خوش دربار میں حاضر ہوئے اور تفویض برار کے معاہدہ پر دستخط لیکر واپس گئے۔ اس معاہدہ کے اہم نکات محتاج تشریح ہیں۔

(۱) واقعات سے ظاہر ہے کہ نظام اس دستاویز پر دستخط کرنے کیلئے بالکل راضی نہ تھے، انہوں نے آخر وقت تک اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور صرف اس وقت اس کی توثیق کی جب انہیں یقین دلایا گیا کہ مزید انکار کی پاداش میں ان کی سلطنت اور ان کی جان تک کی خیر نہیں ہے۔ خود کرنل ڈیوڈسن جو اس وقت اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھا اور بعد میں رزیڈنٹ کے عہدہ پر ممتاز ہوا اپنے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں اعتراف کرتا ہے کہ "میں ان دھمکیوں اور بھپکیوں کا عینی شاہد ہوں جو سابق نظام کو گورنمنٹ کی تجاویز قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے دی گئی تھیں"۔[۱] اس تخویف مجرمانہ کے ساتھ جو معاہدہ عمل میں آیا ہو

---

[۱] Hyderabad affairs Vol. P. 432

اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی معاہدہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک کھلا ہوا استحصال بالجبر تھا اور ساری کارروائی از اول تا آخر ناجائز تھی۔

(۲) امدادی فوج (Subsidiary Force) کے متعلق ۱۷۹۸ء کے معاہدہ میں طے ہوا تھا کہ وہ ہز ہائی نس ان کے ورثاء اور ان کے جانشینوں کی ذات کی نسلاً بعد نسل حفاظت کرے گی" اور تمام باغیوں اور ان لوگوں کو جو اس ریاست کے ممالک محروسہ میں شورش پھیلائیں نگونسار کرے گی۔ مگر ذرا ذرا سی باتوں کے لئے ان کو استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ سبندی کے طور پر اس کو مالگذاری وصول کرنے کے لئے اقطاع ممالک میں متعین کیا جائے گا۔" (دفعہ ۵)

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ میں نواب آصفجاہ نے ۶۳ لاکھ کا ملک دیکر مذکورہ بالا معاہدہ کی اس شرط کو منسوخ کرا دیا" ذرا ذرا سی باتوں کے لئے اسے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کے بجائے دفعہ ۱۷ میں یہ طے کیا کہ جب کبھی نظام کی رعایا میں سے کوئی شخص سرکار نظام کے جائز مطالبات کو ادا کرنے سے انکار کرے گا، یا شورش و بدامنی پھیلائے گا تو اس کے خلاف امدادی فوج کو استعمال کیا جا سکے گا۔ لیکن سنہ ۱۸۵۳ء کے اس معاہدہ کی دفعہ ۲ میں امدادی فوج کے استعمال پر پھر وہی قید لگا دی گئی جو سنہ ۱۷۹۸ء کے معاہدہ کی دفعہ ۵ میں ۶۳ لاکھ کا ملک لینے سے پہلے لگائی گئی تھی اور دفعہ ۳ کی رو سے کنٹنجنٹ کے فرائض میں اس خدمت کو داخل کر دیا گیا جو سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے امدادی فوج کے فرائض میں شامل تھی۔

یہ ایک کھلی ہوئی فریب کاری تھی۔

(۳) کنٹنجنٹ کا خرچ جب تک نظام کے خزانہ سے وصول کیا جاتا رہا اس کی عددی قوت میں ایک آدمی کی کمی بھی گوارا نہ کی گئی۔ مگر جب اس کے مصارف کے لئے ملک مل گیا تو معاہدہ ہی میں یہ بات طے کر لی گئی کہ کنٹنجنٹ کی تعداد ۹ ہزار کے بجائے ۷ ہزار رہے گی۔

(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے نظام کے ملک میں ان کی مدد کرنے کے لئے امدادی فوج ۹ ہزار کی تعداد میں رہنی چاہئے تھی لیکن ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۲ میں طے کیا گیا کہ اس فوج کی صرف ۴ پلٹنیں اور ایک رسالہ حدود ریاست میں رکھا جائے گا حالانکہ آٹھ پلٹنیں اور ۲ رسالے رکھنے کیلئے ۱۸۰۰ء میں ۶۳ لاکھ کا ملک لیا گیا تھا۔

(۴) کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے اور ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کا سود ۶ فیصدی کے حساب سے وصول کرنے کے لئے اس معاہدہ کی رو سے انگریزی حکومت نے صوبۂ برار دوآبہ رائچور اور شولاپور و احمد نگر کی جانب چند سرحدی اضلاع اپنے قبضہ میں لے لئے جن کی مجموعی آمدنی اس وقت ۵۰ لاکھ سالانہ تھی۔ پہلے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ دوامی انتقال ملکیت کو نظام منظور کرلیں لیکن اسے نظام نے سختی کے ساتھ رد کر دیا۔ پھر دوسرا مطالبہ یہ کیا گیا کہ تفویض دوامی ہو۔ مگر نظام کے شاہی حقوق اضلاع مفوضہ پر برقرار رہیں گے۔ نظام نے اس کو بھی نامنظور کیا اس کے بعد

یہ چال چلی گئی کہ معاہدہ کے الفاظ کو مبہم رکھا گیا۔ نظام کو رزیڈنٹ کے ذریعہ یقین دلایا گیا کہ تفویض محض عارضی ہے اور وہ جب چاہیں "فک الرہن" کرا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف برٹش گورنمنٹ کو مطمئن کر دیا گیا کہ تفویض دوامی ہے اور برار اب ہمیشہ کے لئے ہمارے قبضہ میں آ گیا ہے۔ معاہدہ کی دفعہ ۶ میں صرف یہ الفاظ لکھے گئے تھے۔

The Nizam Hereby agrees to assign the districts mentioned

(نظام اس تحریر کی رو سے مبینہ اضلاع کو تفویض کرنا قبول کرتے ہیں)

لیکن کرنل لو نے حضور نظام کو مطمئن کرنے کے لئے سرکاری طور پر (**Formally**) انہیں یقین دلایا تھا جیسا کہ وہ خود اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ

"اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع صرف اس وقت تک کیلئے کنٹیجنٹ کے مصارف کے خاطر سپرد کئے جا سکتے ہیں جب تک ان کو کنٹیجنٹ کی ضرورت رہے"[۱]

---

[۱] میموائرز صفحہ ۴۱۶

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جب نظام کو کنٹیجنٹ کی ضرورت نہ رہے تو وہ اسے موقوف کر کے اپنے اضلاع واپس لے سکتے ہیں۔ مگر یہی کرنل لو اپنے مذکورہ بالا اعلان کے صرف ڈیڑھ مہینہ بعد ۱۹ر جون ۱۸۵۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا سے کہتا ہے کہ :-

"جہاں تک میں جانتا ہوں یہ اضلاع مستقل طور پر ہمارے ہاتھ میں رہنے کے لئے ہیں۔"[1]

خود لارڈ ڈلہوزی نے اپنی ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھا ہے کہ :-

"نظام نے اول سے آخر تک ایسا رویہ ظاہر کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملک کی دوامی تفویض سے قطعی اور شدید انکار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں یہاں تک کہ اضلاع کو اس ضرورت سے ہمارے سپرد کرنے سے بھی انہوں نے کلیتہً نارضامندی کا اظہار کیا۔ کہ شاہی حقوق انہیں کو حاصل رہیں۔"

لیکن یہی لارڈ ڈلہوزی فروری ۱۸۵۶ء میں کہتا ہے کہ

"ایک معاہدہ کی رو سے جو ۱۸۵۳ء میں کیا گیا، ہز ہائی نس نظام نے صوبہ برار اور دیگر ریاست کے دوسرے اضلاع کو آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں دائمی طور پر تفویض کر دیا تاکہ حیدرآباد کنٹنجنٹ مستقل طور پر رکھی جائے۔"[2]

اس سے گورنر جنرل اور رزیڈنٹ دونوں کی بدنیتی ظاہر ہے۔

یہ تھا اس درخت کا پھل جسے ۵۰ سال پہلے بویا گیا تھا پہلے یار وفادار

---

[1] میموآئرز ۲۱۴ [2] میموآئرز صفحہ ۲۱۴

یہ کیا گیا کہ ہم دشمنوں سے تمہارے ملک کی حفاظت کریں گے۔ اور اس حفاظت کے معاوضہ میں ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ کا ملک لیا گیا جو یار وفادار کے کل مقبوضات کا تیسرا حصہ تھا۔ اس کے بعد خود اپنی اغراض کے لئے ایک فوج رکھی گئی۔ اور اس کا خرچ دوست سے مانگا گیا۔ غریب دوست اس کے لئے بھی ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ دیتا رہا۔ مگر جب اس کا خزانہ بالکل خالی ہو گیا۔ اور اس میں اتنا خرچ دینے کی استطاعت نہ رہی۔ تو اپنی فوج پر خود اپنے خزانہ سے روپیہ خرچ کیا گیا/ اور اسے دوست کے حساب میں قرض کے طور پر لکھا جاتا رہا۔ جہانتک دوست کے امکان میں تھا اس نے اس قرض کو بھی ادا کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب اس کے بدن میں ایک خون کا قطرہ بھی نہ رہا تو انہی دوستوں نے جو اس کے محافظ بنکر آئے تھے۔ اس غریب کے گلے پر چھری رکھکر اسی ملک کا ایک دوسرا زرخیز حصہ اس سے چھین لیا جس کی حفاظت کے لئے وہ اس سے پہلے ایک بڑا حصہ دے چکے تھے۔ حفاظت کی تمام اقسام میں یہ سب سے زیادہ عجیب و غریب قسم ہے۔ جس کی ایجاد پر جزیرہ انگلستان کے باشندے بجا فخر کر سکتے ہیں!

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے انگریزی حکومت نے دولت آصفیہ کو اپنی حفاظت میں لیا تھا۔ سنہ ۱۸۰۳ء اور سنہ ۱۸۱۷ء کی لڑائیوں کے بعد جنوبی ہند میں کوئی طاقت ایسی نہ رہی تھی۔ جس سے دولت آصفیہ کو کوئی خطرہ ہوتا۔ حدود ریاست کی چاروں طرف اسی سلطنت برطانیہ کے علاقے پھیلے ہوئے تھے جو ریاست کی محافظ تھی اس کا قدرتی نتیجہ

یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ریاست کے حساب میں فوج کا خرچ سب سے کم ہوتا لیکن دنیا یہ سنکر حیران ہوگی کہ انگریزوں کی محافظت میں آنے اور سب دشمنوں سے مطمئن ہوجانیکے بعد اس ریاست کا فوجی خرچ اتنا بڑھ گیا کہ اس وقت دنیا کی کسی سلطنت کا خرچ اتنا نہ تھا۔ سب سیڈیری فوج پر ۶۳ لاکھ، کنٹنجنٹ پر ۴۲ لاکھ اور خود اپنی قومی فوج پر ۶۴ لاکھ یعنی کل ایک کروڑ ۶۹ لاکھ روپیہ سالانہ وہ حکومت خرچ کر رہی تھی جس کی کل آمدنی ۲ کروڑ سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں دس روپیہ کی آمدنی رکھنے والا شخص اپنے چوکیدار کو ۹ روپے دیتا تھا۔ اور خود اپنا گذر صرف ایک روپیہ میں کرتا تھا۔

۱۸۴۳ء جبکہ مغفرت منزل نواب ناصر الدولہ نے اس ریاست کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو ریاست کے مداخل ومخارج کی حالت یہ تھی [1]

آمدنی بوضع اخراجات نظم ونسق	۱۲۲۴۹۵۴۵ (کلدار)
خرچ خاندان شاہی وملازمین بارگاہ	۲۸۰۱۰۲۷
" کنٹنجنٹ اور پادیسائی کی چوتھ وغیرہ	۴۰۲۴۱۱۴
" شاہی فوج	۶۴۱۳۸۵۲
" منصب دار وغیرہ	۱۷۸۰۱۲۶

---

[1] Hyderabad affairs Vol. II. P. 91-92

خرچ کل ۱۵۰۱۹۱۱۹

خسارہ ۲۷۳۹۵۷۲

ایسی خراب مالی حالت میں ریاست کو سنبھالنا انسانوں کا نہیں فرشتوں کا کام تھا۔ جس ریاست میں پیہم ۲۷ لاکھ کا سالانہ گھاٹا آرہا ہو، اور باوجود اس کے اس پر ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا مستقل بار بھی ڈالدیا گیا ہو اس کا اس طرح مالی انتشار میں مبتلا ہوجانا بالکل ایک قدرتی بات تھی جیسا کہ کرنل ڈیوڈسن نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا ہے۔

"حقیقۃً تعجب اس پر نہیں کہ یہ ریاست ۱۸۵۳ء میں ۴۳ لاکھ کی "قرضدار" کیوں تھی۔ بلکہ اس پر ہے کہ ۵۰ سال تک بری طرح لٹنے اور تباہ ہونے کے باوجود وہ صرف ۴۳ لاکھ ہی کی قرضدار کیوں رہی۔ اس کا بالکل دیوالہ کیوں نہ نکل گیا"

غدر میں نظام دکن کی وفاداری

تفویض برار کے عہد کے نامہ پر دستخط ہونیکے پانچ روز بعد سراج الملک کا انتقال ہوگیا۔ کسی شاعر نے ان کا مادۂ تاریخ اس طرح نکالا ہے۔

ایں بکرد آخرش سراج الملک

جملہ ملک برار داد و برفت

ان کے بعد ان کے بھتیجے نواب سالار جنگ بہادر مدار المہام بنائے گئے اور راجہ نرندر بہادر (ابن راجہ دہراج بہادر ابن راجہ چندو لال)

کو پیشکاری کا عہدہ دیا گیا۔ نواب ناصرالدولہ بہادر غفران منزل عہدنامہ تفویض برار پر دستخط کرنیکے بعد چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے اور اس کا رنج آخران کی جان ہی لیکر رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اوران کی جگہ نواب افضل الدولہ مسند نشین ہوئے جنھوں نے غفران منزل کے انتظامات کو بحال رکھا۔

یہی زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں وہ جنگ آزادی برپا ہوئی جو غلطی سے "غدر" کے نام سے مشہور ہو گئی ہے۔ اپنے ہاتھوں سب کھو چکنے کے بعد ہندوستانیوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب سب کچھ بگڑ چکا تھا۔ تاہم یہ آخری سنبھالا ابھی اتنے زور کا تھا کہ ایک دفعہ انگریزی سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں اس وقت بمبئی کے گورنر نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو تار دیا کہ :-

If the Nizam goes all is lost

(اگر نظام گئے۔ تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائیگا)

فرمانروائے دکن کی قوت اس گئی گذری حالت میں بھی اتنی زبردست تھی کہ اگر وہ انگریزی سلطنت کے دشمنوں میں شامل ہو جاتے تو یہ سستے داموں حاصل کی ہوئی سلطنت سستے داموں نکل جاتی اور اگر پھر واپس ملتی بھی تو بہت مہنگے داموں ملتی۔ ایک انگریز مصنف نے بالکل سچ لکھا ہے۔

"اگر نظام بگڑ بیٹھتے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا نتائج رونما ہوتے

ناگپور میں عین موقع پر جس سازش کا انکشاف ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آس پاس کی ریاستیں بغاوت کے لئے کس قدر تیار بیٹھی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ٹریلکین کے مسلمان ملیار فقص پر دست درازی کے لئے صرف حیدرآباد کی طرف سے اشارہ کے منتظر بیٹھے تھے مجھے جس کسی فوجی آدمی سے گفتگو کرنیکا اتفاق ہوا۔ اس نے یہی کہا کہ اگر حیدرآباد اٹھ کھڑا ہوتا تو ہم کرنول، ناگپور بلاری، کڑاپہ، بنگلور، مدراس، ترچناپلی اور دوسرے شہروں میں بغاوت سے نہ بچ سکتے۔ اور یہ بھی مشکل تھا کہ بمبئی جو مدراس ہی کی طرح بے چین تھا۔ اس مرض متعدی کے اثر سے بچ رہتا۔"

لیکن تمام ان بیوفائیوں اور بدعہدیوں کے باوجود انگریزی حکومت نے نواب میر نظام علی خان کے انتقال سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کی تھیں۔ اور اس ظلم عظیم کے باوجود جو چار ہی سال پہلے برار کے استحصال بالجبر کی صورت میں کیا گیا تھا۔ نظام انگریزی حکومت کی وفاداری پر ثابت قدم رہے۔ ان کی رعایا میں قومی و مذہبی جوش پورے زور کے ساتھ بھڑک چکا تھا۔ حیدرآباد کے مسلمان جہاد کے لئے بے چین تھے۔ نظام اور ان کے مدارالمہام پر مذہب و قومیت کی خاطر ہر قسم کی ترغیبات کا زور ڈالا جا رہا تھا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس نازک وقت میں یہ بات انگریزوں کی قدرت سے باہر تھی کہ نظام کو وفادار رہنے پر مجبور کر سکتے لیکن نواب آصفجاہ

نے صرف یہی نہیں کہ اپنا وزن دشمنوں کے پلڑے میں ڈالنے سے احتراز کیا، بلکہ اس سے بڑھکر انہوں نے اپنی پوری قوت انگریزوں کی امداد واعانت میں صرف کردی، اور انھیں کی مدد سے سلطنت برطانیہ ہندوستان میں از سر نو مستحکم ہوئی۔

جس وقت غدر کی اطلاع حیدرآباد پہونچی تو تمام شہر میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ ۱۳ر جون کو خفیہ طور پر ایک اشتہار شائع ہوا جس میں مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا گیا تھا۔ اس کے بعد مکہ مسجد میں ایک پرجوش جلسہ ہوا اور سبز علم بلند کردیا گیا، قریب تھا کہ ہنگامہ برپا ہوجاتا۔ مگر سالارجنگ نے شہر میں عربی فوج کے پہرے لگادئیے اور تمام جوشیلے مجامع کو بزور منتشر کرادیا۔ تاہم غیظ وغضب کی آگ جو انگریزوں کے خلاف بھڑک رہی تھی فرو نہ ہوئی۔ اور آخر کار ۱۷ر جولائی کی صبح کو روہیلوں کی ایک زبردست جماعت نے ریزیڈنسی پر حملہ کرہی دیا جسے بڑی مشکل سے رد کیا گیا اور حملہ آوروں کے لیڈروں میں سے ایک (طرہ باز خاں جمعدار) کو گولی ماردی گئی۔ اور دوسرے (مولوی علاؤالدین) کو کالے پانی بھیجدیا گیا۔ اس وقت شہر میں تقریبا ۲۶ ہزار روہیلے، سکھ، سندھی، حبشی، اور ترک ومغل موجود تھے اور شہر کی ۳ لاکھ آبادی کا بھی ایک بڑا حصہ مسلح تھا۔ خود سرکاری فوج کی ہمدردیاں بھی ان لوگوں کے ساتھ تھیں جو انگریزوں کے اخراج کے لئے لڑنا چاہتے تھے ایسی حالت میں نواب افضل الدولہ اور سالارجنگ

سے یہ انگریزوں کی وفاداری پر قائم رہنا اور ان کی مدد کرنا جس قدر مشکل تھا، ظاہر ہے، مگر ان تمام نازک حالات کے باوجود انہوں نے ثابت قدمی کے ساتھ پہلے اپنی ریاست میں امن قائم کیا اور اس کے بعد اپنی فوج سے برٹش گورنمنٹ کی امداد کی۔ جس کی بدولت وسط ہند میں انگریزی تسلط از سر نو قائم ہوا۔ جھانسی، نیمچ، اور مہید پور کے مورچے سر ہوئے اور ان زبردست طاقتوں کا ہمیشہ کیلئے قلع قمع ہو گیا جو ہندوستان کو سپید خطرے سے نجات دلانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس ہنگامہ میں نظام کی طرف مادی امداد ہی انگریزوں کے کام نہیں آئی۔ بلکہ اخلاقی امداد نے بھی ان کو بہت کچھ سہارا دیا۔ اور یہ اخلاقی امداد ایسی تھی جس کا اثر صوبہ سرحد کے دور و دراز علاقوں تک پہنچا ہوا تھا۔ سر ڈ نے کاٹن جو ۱۸۵۷ء میں پشاور کی فوج کا کمانڈر تھا اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

> "شمالی مغربی سرحد کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے متعدد مرتبہ مجھ کو یقین دلایا کہ کسی نہ کسی دن ہماری حکومت کے خلاف ایک عام بغاوت کھڑی ہو جائے گی۔ دہلی سے مغل اعظم کی نسل مٹ جانے کے بعد وہ نظام کو اپنا بڑا سردار اور اسلامی مقاصد کا سہارا سمجھتے ہیں"[1]

---

[1] Nine years on the Northwest Frontier P 307

حضور نظام کی ان عملی ہمدردیوں کے باوجود انگریز ان کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور انہیں ہر وقت یہ بدگمانی تھی کہ یہ سب کچھ خلوص کیساتھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن آخر میں خود ریذیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کو اعتراف کرنا پڑا کہ :-

"میں نے ایسے گوشوں اور ایسے طریقوں سے جن پر مشکل سے کوئی شبہہ ہو سکتا تھا۔ نظام کی شدید نگرانی کی ہے۔ اگرچہ پیغامبران کے پاس آتے تھے لیکن ان کی داستانیں سننے کے بعد وہ ہر ایسی تحریک میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے تھے، جو برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہوتی ہے" [۵۱]

وفاداری کا صلہ

حضور نظام کی اس بیش قیمت امداد اور مخلصانہ وفاداری پر زبانی تعریف و توصیف کے پھول تو بہت برسائے گئے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کی قدر دانی کا عملی ثبوت کیا دیا گیا؟ اس کیلئے ہم کو غدر کے بعد دونوں سلطنتوں کے معاملات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جولائی سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ کی جانب سے حضور نظام کو ۱۰ ہزار پونڈ کے اور سالار جنگ بہادر کو ۳ ہزار پونڈ کے تحائف

Our Faithful ally the Nizam P.291

بھیجے گئے، مگر دستور قدیم کے مطابق اس کے جواب میں اعلحضرت نے ۱۵ ہزار پونڈ کے تحائف گورنر جنرل کو بھیجے۔ جو از روئے قاعدہ گورنمنٹ کے خزانہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اس تجارت میں گورنمنٹ نے کھونے کے بجائے کچھ پا ہی لیا۔

غدر میں سرکار نظام کی فوج نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اور سلطنت برطانیہ کی حفاظت میں جو جاں نثاری کی تھی، اس پر ازراہِ خوشنودی یہ انعام فرمایا گیا کہ جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں کے لئے پانچ پانچ روپیہ مہینہ کا زائد بھتہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس "فضول خرچی" کا بوجھ سرکار انگریزی کے خزانہ پر نہیں پڑا۔ بلکہ خود سرکار نظام ہی کے خزانہ پر پڑا کیونکہ یہ زائد خرچ برار کی آمدنی سے وصول کیا گیا۔ اور اسے نظام کے حساب میں محسوب کر لیا گیا۔

اس کے بعد "اس گرانمایہ عزت و احترام" کے مزید اظہار کے لئے جو "ملکہ معظمہ" کے دل میں ہز ہائی نس کے لئے موجود تھی ۱۸۶۰ء کے آخر میں ایک عہد نامہ لکھا گیا۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ غدر کی خدمات کا "اجر" تھا۔ اس معاہدہ میں "یار وفادار" پر جو انعام فرمائے گئے ان کی حقیقت ذرا تشریح کی محتاج ہے۔

(۱) دفعہ دوم کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے شوراپور کا علاقہ نظام کے کامل شاہی اختیارات میں دیدیا۔ اس علاقہ کی آمدنی ۱۳ لاکھ

۲۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ پہلے یہ علاقہ خود سرکار نظام کا تھا
۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۷ میں تصریح گدوال کے ساتھ شوراپور
کے زمیندار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور عہد کیا گیا ہے کہ اگر وہ سرکار
نظام کے جائز مطالبات کو ادا کرنے میں قاصر رہے گا۔ یا بدامنی
پھیلائے گا تو اس کے خلاف جمعیت نعلبندی (سبسڈیری فورس)
کو استعمال کیا جا سکیگا۔[1] ۱۸۴۲ء میں سرکار نظام کو اس سے
شکایت ہوئی کہ چند سال سے نہ اس نے پیش کش حاضر کیا اور
نہ نذرانہ، معاہدہ کے مطابق رزیڈنٹ سے استمداد کی گئی تو اس نے
کپتان میڈوز ٹیلر کو تحقیقات کے لئے بھیجا اور آخر میں مطالبات
کی تدریجی تحصیل کے لئے دونوں سرکاروں کے اتفاق سے اس کو
"اسپیشل ایجنٹ" مقرر کیا گیا۔ چند سال اس طرح گذرے تھے
کہ شوراپور کے نوجوان راجہ نے سرکار نظام کے خلاف بغاوت
کردی اور اس کی سرکوبی کے لئے جمعیت نعلبندی کی بجائے،
(جس کا معاہدہ میں وعدہ کیا گیا تھا) کنٹنجنٹ فورس کو بھیجا
گیا۔ ازروئے عقل اور ازروئے قانون یہ لازم تھا کہ اس
راجہ کو ازسرنو اسی حکومت کا مطیع بنایا جاتا۔ جس کا وہ پہلے
باجگذار تھا۔ لیکن کیا یہ گیا کہ نظام کی فوج سے نظام ہی کی
رعیت کے ایک باغی سردار کی سرکوبی کی گئی۔ اور بغیر نظام

۱؎ Aitchison Vol. IX P. 72

کے بجائے اس کا علاقہ انگریزی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔ [۱]

یہی وہ صریح ظلم تھا جس کی تلافی سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں کی گئی، اور یہ ایسی چیز تھی جس کو مشکل ہی سے صلہ و انعام کہا جا سکتا ہے۔

(۲) کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں حضور نظام کے ذمہ جو ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کا "قرض واجب الادا" تھا اس کو دفعہ سوم کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے معاف کر دیا۔

اول تو یہ قرض فی الواقع کوئی قرض ہی نہیں تھا۔ گذشتہ صفحات میں اس کی جو حقیقت بیان کی جا چکی ہے، اسے پڑھنے کے بعد کوئی شخص نہ اسے قرض سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی معافی کو کسی انعام سے تعبیر کر سکتا ہے، تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ "قرض" ہی تھا۔ تب بھی جس صورت میں اسے معاف کیا گیا ہے وہ ایسی ہے کہ انگریزی حکومت بجائے نقصان کے فائدہ ہی میں رہی ہے۔ سنہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) میں یہ طے ہوا تھا کہ رزیڈنٹ نظام کے تفویض کردہ علاقوں کی آمدنی اور خرچ کا صحیح اور ٹھیک ٹھیک حساب سرکار نظام کے سامنے برابر پیش کرتا رہے گا۔ اور دفعہ ۶ کے مطابق تمام اخراجات وضع کر کے جو کچھ بچے گا۔ وہ سرکار نظام کے خزانہ

---

[۱] Hyderabad affairs Vol.II.P.41.

میں داخل کردے گا[1] اس میں شک نہیں کہ معاہدہ میں یہ تصریح نہیں کیگئی تھی کہ علاقہ مفوضہ کے نظم و نسق کے مصارف کیا ہونگے لیکن کرنل لو نے سرکار نظام کو یقین دلاگیا تھا کہ ۲ ر فی روپیہ یعنی کل آمدنی کے ۱/۸ سے زیادہ خرچ نہیں کیا جائیگا۔ کرنل ڈیوڈسن اپنے ۲۰ ر جولائی ۱۸۵۹ء کے مراسلہ میں صاف لکھتا ہے کہ:-

"مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جنرل لوسی بے نے سابق وزیر سراج الملک اور موجودہ وزیر سالار جنگ کو یہ سمجھنے کا موقع دیا تھا کہ ہمارے انتظام کا خرچ ۲ ر فی روپیہ یعنی کل آمدنی کے ۱۲ ۱/۲ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا۔"[2]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ اپنے ۷ ر جولائی ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں تسلیم کرتا ہے کہ

"جب معاہدہ پر دستخط کئے گئے تھے تو نظام کو یہ توقع تھی کہ ان اضلاع کے انتظام کا خرچ ۲ ر فی روپیہ یعنی ۱۲ ۱/۲ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا۔"[3]

لیکن ان تصریحات کے باوجود علاقہ مفوضہ کی ۴۵ لاکھ سالانہ

---

[1] Aitchison Vol. IX P. 96

[2] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 410

[3] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 414

آمدنی میں سے تقریباً ۷۱ لاکھ روپیہ سالانہ نظم ونسق پر خرچ کیا گیا جو ۶ آنہ اور ۷ آنہ فی روپیہ کے قریب تھا۔ اور دوسرے اخراجات ملا کر اضلاع مفوضہ کی ساری آمدنی انگریزی حکومت نے خود ہی خرچ کر ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء تک بچت کی ایک پائی بھی سرکار نظام کے خزانہ میں داخل نہ کی گئی۔ خود گورنر جنرل اور رزیڈنٹ کو اپنی اس فضول خرچی کا اعتراف تھا۔ کرنل ڈیوڈسن اپنے ۶؍ جولائی ۱۸۵۹ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ

"میں یہ توقع کرتا ہوں کہ عملہ کے اخراجات کی بھاری رقم اور ہمارے انتظام کی فضول خرچی پر وزیر (یعنی حیدرآباد کا مدارالمہام) اعتراض کرے گا۔"[1]

اسی اعتراض کے خوف سے سات سال تک اضلاع مفوضہ کے حسابات سرکار نظام کو نہیں دیئے گئے اور باوجود بار بار مطالبہ کرنے کے معاہدانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے پہلوتہی کی جاتی رہی۔ جس کے متعلق لارڈ کیننگ کو اپنے ۷؍ جولائی ۱۸۶۰ء کے نوٹ میں اعتراف کرنا پڑا کہ:۔

"از روئے معاہدہ ہم ان حسابات کو سال کے سال پیش کرنے پر مجبور تھے یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔"

---

[1] Hyderabad affairs P. 410

اور لارڈ لانس کو بھی ۱۳؍ فروری ۱۸۶۷ء کے ایک مراسلہ میں تسلیم کرنا پڑا کہ
”سالانہ حسابات پیش کرنے میں کوتاہی کرنا ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ
(۸) کے صریح الفاظ سے انحراف تھا“ ؎۱

اس خلاف ورزی معاہدہ سے برٹش گورنمنٹ سات سال تک جو ناجائز فائدہ اٹھاتی رہی اور سرکار نظام کو اس کے تفویض کردہ علاقہ کے اس منافع میں سے ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) کی رو سے اس کو ملنا چاہیے تھا۔ محروم کر کے جو ظلم کرتی رہی اس کی تلافی کے لئے اس نے ۱۸۶۰ء میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر سرکار نظام برٹش گورنمنٹ سے مفوضہ اضلاع کا پچھلا حساب نہ مانگے تو اس کے عوض وہ اس ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کی رقم کو معاف کر دیگی۔ جو قرض کے طور پر سرکار نظام کے ذمہ واجب الادا ہے۔ ۷ جولائی ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں زیر بحث معاہدہ کی شرائط تجویز کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری نے کرنل ڈیوڈسن رزیڈنٹ کو لکھا تھا کہ

”گورنر جنرل اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں جو زائد سول اخراجات ہوئے ہیں ان کو نظام کی طرف سے ۵۰ لاکھ روپیہ حالی کے قرض کی ادائیگی طور پر تسلیم کریں۔“ ؎۲

؎۱ میمو رآئبرز صفحہ ۴۲۱ و ۴۲۲

؎۲ Hyderabad Affairs P. 414, 415

اور یہی نہیں بلکہ اس پچاس لاکھ کے قرض کی معافی کے معاوضہ میں
گورنمنٹ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ آئندہ کے لئے بھی سرکار نظام اضلاع مفوضہ
کے حسابات کا مطالبہ نہ کرے اور مصارف کی کمی و زیادتی کو برٹش گورنمنٹ
کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑ دے، چنانچہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۴
میں بتصریح یہ طے کرلیا گیا کہ ہز ہائی نس نظام کی حکومت اضلاع مفوضہ
کے سابق، حال اور آئندہ کے حسابات کا مطالبہ ترک کر دیگی۔ اور اگرچہ
برٹش گورنمنٹ پر لازم ہوگا کہ اضلاع مفوضہ کی آمدنی میں سے مقررہ
مصارف وضع کر کے بچت کی رقم سرکار نظام کے خزانہ میں داخل کرے،
لیکن مصارف کا تعین کا اختیار کلیتہ برٹش گورنمنٹ کو ہوگا۔ ۵۷
اس شرط سے برٹش گورنمنٹ نے جو فائدہ اٹھایا اس کا حال آگے آتا ہے
اسے پڑھکر ہر شخص معلوم کریگا کہ ۵۰ لاکھ کے قرض کی معافی کے بدلے میں اس
نے ۳۲ سال کے عرصہ میں اس سے وہ چند فائدہ اٹھایا پس اس کو
بھی کوئی ذی ہوش "انعام" سے تعبیر نہیں کر سکتا۔
(۳) دفعہ ۵ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے اضلاع مفوضہ میں
سے دوآبہ رائچور اور وہ اضلاع جو کلکٹری احمد نگر اور شولاپور سے متصل
واقع ہیں۔ سرکار نظام کو واپس کر دے اول تو یہ وہی اضلاع تھے جو
۱۸۵۳ء میں زبردستی سرکار نظام سے چھین لئے گئے تھے دوسرے خود

---

۵۷ Aitchison P. 105

گورنر جنرل کے اعتراف کے مطابق کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے جتنے علاقے کی ضرورت تھی اس کے لئے برار پائین گھاٹ اور بالا گھاٹ بالکل کافی تھے اور یہ علاقے قطعاً زائد از ضرورت کے لئے گئے تھے[1] اسلئے ان علاقوں کو کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے نام سے اپنے قبضہ میں رکھنے کا گورنمنٹ کو کوئی حق نہ تھا اور انہیں واپس کرنے پر وہ مجبور تھی لیکن اس اخلاقی و قانونی فرض کو بھی اس نے بلا معاوضہ انجام دیا۔ اس نے اس کے بدلے میں متعدد قسم کے فائدے اٹھائے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دفعہ ہفتم کی رو سے برار کے وہ تعلقے حاصل کئے جو صرف خاص کے علاقہ میں تھے اور جن کی آمدنی ۶۵۵۰۵۰ روپیہ سالانہ تھی۔

دفعہ ہشتم کی رو سے سرکار نظام کے وہ مقبوضات حاصل کر لئے جو دریائے گوداوری اور پائین گنگا کے دوسری جانب تھے۔ ان اضلاع کی آمدنی ۱۶۵۷۷۵ روپیہ سالانہ تھی اور ان کے جنگلات کی لکڑی کی قیمت بھی ۵۰ لاکھ روپیہ سے کم نہ تھی[2] علاوہ ازیں اس علاقہ کے حاصل کرنے سے انگریزی حکومت کو فوجی فوائد بھی حاصل ہوئے جنکو کپتان ہیگ ....

ڈسٹرکٹ انجینر نے اپنے ۳۰ اگست ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں بیان کیا ہے[3]۔ اس علاقہ کو حاصل کرنے کے لئے برٹش گورنمنٹ اس قدر بے چین تھی کہ سرکار نظام کو

---

[1] دیکھو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کا مراسلہ مورخہ ۷ جولائی ۱۸۶۱ء نمبر ۱۵۰ صیغہ خارجہ

[2] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۳ اپریل ۱۸۶۶ء

[3] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 429

صاف طور پر لکھدیا گیا تھا کہ

"برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس نظام کو گوداوری کے تعلقوں کی تفویض سے پھر جانے کی ہرگز اجازت نہ دے گی۔ اور اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں گے تو اس سے دونوں حکومتوں کے درمیان غیر دوستانہ اور غصہ و ناراضی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے[1]"

یہ فوائد اٹھانے کے بعد اگر برٹش گورنمنٹ نے سرکار نظام کو خود اس کا زبردستی چھینا ہوا ملک واپس کر دیا تو اس کو مشکل ہی سے "انعام" کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی حکومت نے نواب افضل الدولہ بہادر پر یہ اثر جمانے کی کوشش تو ضرور کی تھی کہ یہ سب کچھ ان کی بیش قیمت خدمات کے صلہ میں انعام کے طور پر دیا جا رہا ہے لیکن کرنل ڈیوڈسن سے گفتگو میں انہوں نے صاف طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا کہ جو کچھ ان کا تھا وہی ان کو دیا جا رہا ہے[2] خود انصاف پسند انگریزوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں انگریزی حکومت نے نظام کو جتنا فائدہ پہنچایا اس سے زیادہ خود حاصل کر لیا چنانچہ ۳۰ اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک لیڈنگ آرٹیکل میں ٹائمز آف انڈیا نے صاف لکھا تھا کہ

"معاہدہ کی گفت و شنید میں ہم نے بہت سے فوائد حاصل کر لئے۔ اس معاملہ سے جو لوگ بہتر واقفیت رکھتے ہیں ان کا قول ہے کہ ۱۸۶۰ء کے ضمنی معاہدہ میں منافع و فوائد کے ترازو کا پلڑا ہماری طرف زیادہ جھکا ہوا تھا۔"

---

[1] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 260

[2] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 420

سر سالار جنگ کا مطالبۂ استردادِ برار

سر سالار جنگ مرحوم جو معاہدۂ تفویض برار کے ایک ہی ہفتہ بعد اپنے چچا سراج الملک کی جگہ مدار المہام بنائے گئے تھے۔ اپنے خاندان کی پیشانی پر اس کو بڑا داغ سمجھتے تھے کہ اس کے ایک فرد کی وزارت میں ملک برار دولت آصفیہ کے قبضہ سے نکلا ہے ایک مرتبہ انہوں نے خود انگریزی رزیڈنٹ کرنل لومسڈن (Lumsden) سے کہا تھا کہ

"ان اضلاع کی تفویض کا واقعہ میرے چچا کی زندگی کے آخری لمحوں میں پیش آنے سے والئ ملک اور اہل ملک کی نظروں میں میرے خاندان کی رسوائی ہوئی ہے، اعلیٰحضرت مغفرت مکاں نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ ان اضلاع کی واپسی کے لئے اپنا سارا زور صرف کردو۔ اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے خاندان پر سے اس داغ کو دور کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا۔[۵۱]

یہی خیال تھا جس کی بناء پر ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء تک سات سال کی مدت میں انہوں نے کم از کم چھ مرتبہ واپسی برار کی درخواست کی[۵۲]۔ مگر یہ درخواست چونکہ محض درخواست تھی۔ اس میں مطالبہ کا زور نہ تھا اس لئے اسکی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اور ۱۸۶۰ء میں مفوضہ علاقہ کا کچھ واپس کرکے انکی اشک شوئی

---

۵۱ Hyderabad Affairs Vol. II. P. 356

۵۲ Hyderabad Affairs Vol. II P. 380

کردی گئی۔ لیکن سالار جنگ اس سے مطمئن ہونے والے نہ تھے۔ وہ اس مطالبہ کے لئے ایک اچھے موقع کے منتظر تھے اور وہ موقع میسور کے واقعات نے ان کو بہم پہونچادیا۔

۱۷۹۹ء کی جنگ میسور میں جب ٹیپو سلطان کی پوری مملکت فتح ہوگئی تو از روئے معاہدہ یہ ضروری تھا کہ ملک کو انگریزی حکومت اور سرکار نظام کے درمیان برابر برابر تقسیم کردیا جاتا۔ لیکن ایچی سن .... کے بقول انگریزی حکومت نے اس خیال سے کہ نظام کی طاقت حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے میسور کے اس پرانے شاہی خاندان کو جسے حیدر علی نے بیدخل کردیا تھا ڈھونڈ کر نکالا اور ۳۷۴۰۷۶ ہن کا ملک دیکر تین برس کے ایک بچے کو اس کا راجہ بنادیا[1] چونکہ یہ ریاست محض نظام کے توڑ پر قائم کی گئی تھی۔ اس لئے انگریزی حکومت کی سیاست کا میلان اسی طرف رہا کہ جب کوئی بہانہ ملے تو اسے مٹا کر سارا ملک انگریزی مقبوضات سے ملحق کرلیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۳۱ء میں مہاراجہ کی فضول خرچی کے بہانہ سے اس میں مداخلت کی گئی اور ۱۸۳۴ء میں ساری ریاست انگریزی انتظام میں لے لی گئی۔ ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ میسور نے اپنے ملک کی بحالی کا مطالبہ کیا مگر اسے رد کردیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے پھر مطالبہ کیا اور اسے پھر جواب ملا کہ مہاراجہ نہ کسی حق کے طور پر ریاست کی بحالی کا مطالبہ کرسکتے ہیں اور نہ اسے بحال کرنا باشندگان ریاست کے مفاد کے لئے مفید ہوسکتا ہے ۱۸۶۳ء میں مہاراجہ نے ایک لڑکے کو متبنیٰ

---

[1] Aitchison Vol IX. P. 182-183

بنانے کی اجازت مانگی تو اسے بھی رد کر دیا گیا اور ۱۸۶۵ء میں جب مہاراجہ نے ایک لڑکے کو گود لے لیا تو برٹش گورنمنٹ نے اس کارروائی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ کے اس رویہ سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے ملک کو ملحق کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اس لئے سالار جنگ نے اس موقع کو اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے کیلئے موزوں خیال کیا اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو سر جارج یول (رزیڈنٹ) کے نام ایک خط لکھا جس کے اہم نکات حسب ذیل تھے۔

(۱) ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ برار کی آمدنی میں سے جو کچھ بچت ہو گی اسے سرکار نظام کے حوالے کر دے گی۔ لیکن معاہدہ کی تکمیل کو چھ سال گذرنے کے باوجود اس سرکار کو ایک پیسہ بھی بچت کا نہیں ملا اور نہ آئندہ ملنے کی امید ہے کیونکہ برار کی ۵ لاکھ آمدنی میں سے ۲۳ لاکھ روپیہ صرف نظم و نسق میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔ سرکار نظام اس وقت روپے کی سخت ضرورت مند ہے اور وہ اس کا حق رکھتی ہے کہ کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کا دوسرا اطمینان بخش انتظام کر کے اپنے ان اضلاع کو واپس لے لے۔

(۲) برٹش گورنمنٹ نے میسور کے علاقہ کو ملحق کر لینے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے اس لئے سرکار نظام کو اس علاقہ میں سے اسی طرح حصہ لینا چاہئے جس طرح ۱۷۹۹ء کے معاہدۂ تقسیم میسور میں ملا تھا اگر برٹش گورنمنٹ میسور کی نئی ریاست قائم نہ کرتی تو بلا شک و ریب یہ ملک سرکار نظام اور سرکار انگریزی کے درمیان تقسیم ہوتا جس طرح اس وقت اس ریاست کا قیام سرکار نظام کی موافقت سے

ہوا تھا۔ اسی طرح اب اس کا سقوط بھی اگر ہو تو سرکار نظام کی موافقت سے ہونا چاہیئے

(۳) ۱۸۰۰ء کے خفیہ معاہدہ کی دفعہ ۳ میں طے ہوا تھا کہ آئندہ جو علاقے دونوں حکومتوں کی متحدہ افواج کی قوت سے فتح ہوں گے وہ دونوں حکومتوں کے درمیان برابر تقسیم کئے جائیں گے۔ چنانچہ اسی دفعہ کے ماتحت ۱۸۰۴ء اور ۱۸۱۲ء میں سرکار نظام کو پیشوا اور سندھیا کے مفتوحہ علاقوں میں سے حصہ دیا گیا تھا اور اب اسی معاہدہ کے مطابق کرنول اور گومسور کے علاقوں میں سے سرکار نظام کو کم از کم ۱۵۰۰۰۰ روپیہ سالانہ کا حصہ ملنا چاہیئے کیوں کہ ان علاقوں کی فتح میں اس سرکار کی فوج شامل تھی۔

(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے کرنول کا صرف پیش کش تفویض کیا گیا تھا نہ کہ اصل علاقہ از روئے آئین ملک بدستور سرکار نظام کی ملک رہا اور اس کے حق ملکیت کو اس سرکار نے کبھی تفویض نہیں کیا اس لئے اسکی آمدنی (پیشکش کو وضع کر کے) اس سرکار کا حق ہے۔

ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے سرکار نظام کے حقوق حسب ذیل ہیں۔

کرنول کی مالگذاری بوضع پیش کش	۱۷۰۰۰۰۰
گومسور کی مالگزاری میں سرکار نظام کا حصہ	۱۵۰۰۰۰
میسور کی ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کا نصف	۳۱۵۰۰۰۰
جملہ	۶۰۰۰۰۰۰

چونکہ ابھی ریاست میسور کے انقراض کا مسئلہ طے نہیں ہوا ہے اس لئے فی الحال اسے چھوڑ کر اول الذکر دو علاقوں کا ۱۸۵۰۰۰۰ روپیہ سالانہ کنفیجبٹ

کے مصارف کے لئے قبول کیا جائے اور بقیہ ۸۵۰۰۰۰ روپیہ کے لئے ملک میسور کا تصفیہ ہونے تک ہم قابل اطمینان ضمانت فراہم کر دیں گے۔ اس انتظام کے بعد ملک برار سرکار نظام کو واپس دیدیا جائے[1]

اس مراسلہ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ برار کی آمدنی میں سے تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ سال کے ختم ہونے سے پہلے سرکار نظام کو دینے کے احکام جاری ہوگئے دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۶ء میں مہاراجہ میسور کے گود لئے ہوئے لڑکے کو ان کا وارث تسلیم کر لیا گیا اور مہاراجہ کے مرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اس لڑکے کی گدی نشینی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔

دوسری طرف سر سالار جنگ کے اس خلاف توقع مطالبہ سے برطانی حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ۱۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو رزیڈنٹ نے ایک طویل نوٹ کے ساتھ سالار جنگ کا خط گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیجا، اور اس میں بڑی کاوش سے ان کے دلائل کی تردید کی اس کے جواب میں ۱۳ فروری ۱۸۶۷ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری مسٹر وائلی . . . . . . نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا جس کے ابتدائی فقروں میں یہ فقرہ خصوصیت کے ساتھ ان جذبات غیظ و غضب کو ظاہر کرتا ہے جو مال مغصوبہ کی بازطلبی پر غاصبوں کی جماعت میں ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اس میں لکھا تھا کہ

"وائسرائے یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ حکومت حیدرآباد کے موجودہ دعاوی

---

[1] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 625-652

ہوا تھا۔ اسی طرح اب اس کا سقوط بھی اگر ہو تو سرکار نظام کی موافقت سے ہونا چاہیئے
(۳) ۱۸۰۰ء کے خفیہ معاہدہ کی دفعہ ۳ میں طے ہوا تھا کہ آئیندہ جو علاقے دونوں حکومتوں کی متحدہ افواج کی قوت سے فتح ہوں گے وہ دونوں حکومتوں کے درمیان برابر تقسیم کئے جائیں گے۔ چنانچہ اسی دفعہ کے ماتحت ۱۸۰۴ء اور ۱۸۱۲ء میں سرکار نظام کو پیشوا اور سندھیا کے مفتوحہ علاقوں میں سے حصہ دیا گیا تھا اور اب اسی معاہدہ کے مطابق کرنول اور گومسور کے علاقوں میں سے سرکار نظام کو کم از کم ۱۵۰۰۰ روپیہ سالانہ کا حصہ ملنا چاہئے کیوں کہ ان علاقوں کی فتح میں اس سرکار کی فوج شامل تھی۔
(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے کرنول کا صرف پیش کش تفویض کیا گیا تھا نہ کہ اصل علاقہ از روئے آئین ملک بدستور سرکار نظام کی ملک رہا اور اس کے حق ملکیت کو اس سرکار نے کبھی تفویض نہیں کیا اس لئے اسکی آمدنی (پیشکش کو وضع کرکے) اس سرکار کا حق ہے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکار نظام کے حقوق حسب ذیل ہیں۔

کرنول کی مالگذاری بوضع پیش کش	۱۷۰۰۰۰
گومسور کی مالگزاری میں سرکار نظام کا حصہ	۱۵۰۰۰
میسور کی ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کا نصف	۴۱۵۰۰۰
جملہ	۶۰۰۰۰۰

چونکہ ابھی ریاست میسور کے انقراض کا مسئلہ طے نہیں ہوا ہے اس لئے فی الحال اسے چھوڑ کر اول الذکر دو علاقوں کا ۱۸۵۰۰۰ روپیہ سالانہ کنٹنجنٹ

کے مصارف کے لئے قبول کیا جائے اور بقیہ ......۵۰۰ روپیہ کے لئے ملک میسور کا تصفیہ ہونے تک ہم قابل اطمینان ضمانت فراہم کردیں گے۔ اس انتظام کے بعد ملک برار سرکار نظام کو واپس دیدیا جائے[۵۱]

اس مراسلہ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ برار کی آمدنی میں سے تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ سال کے ختم ہونے سے پہلے سرکار نظام کو دینے کے احکام جاری ہوگئے دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۷ء میں مہاراجہ میسور کے گود لئے ہوئے لڑکے کو ان کا وارث تسلیم کرلیا گیا اور مہاراجہ کے مرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اس لڑکے کی گدی نشینی کی رسم بھی ادا کردی گئی۔

دوسری طرف سر سالار جنگ کے اس خلاف توقع مطالبہ سے برطانی حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو رزیڈنٹ نے ایک طویل نوٹ کے ساتھ سالار جنگ کا خط گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیجا، اور اس میں بڑی کاوش سے ان کے دلائل کی تردید کی اس کے جواب میں ۱۳ فروری ۱۸۶۷ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری مسٹر وائلی .... نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا جس کے ابتدائی فقروں میں یہ فقرہ خصوصیت کے ساتھ ان جذبات غیظ وغضب کو ظاہر کرتا ہے جو مال مغصوبہ کی بازطلبی پر غاصبوں کی جماعت میں ہمیشہ پیدا ہوجایا کرتا ہے اس میں لکھا تھا کہ

"وائسرائے یہ تسلیم نہیں کرسکتے کہ حکومت حیدرآباد کے موجودہ دعاوی

۵۱؎ Hyderabad Affairs Vol. II. P. 625-652

صحیح اور مبنی بر انصاف ہیں۔ کونسل میں ان پر اسی قدر گہرا اور متفکرانہ غور و خوص کیا گیا جسقدر مسئلہ کی اہمیت اور اس سے زیادہ خود نظام کی آزمودہ وفاداری متقاضی تھی مگر ہز اکسلنسی نے اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ یہ دعاوی کلیتہً بے بنیاد ہیں اور صحت و سچائی کا شائبہ بھی ان کی تائید میں موجود نہیں ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کیلئے یہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کہ کسی دیسی ریاست کی درخواست پر سخت الفاظ میں کلام کرے۔ مگر سر سالار جنگ کے خط میں فضول اور ادعا کی جو روح بھری ہوئی ہے جو انکے شاہی آقا کے مرتبے اور خود انکی شان تدبر دونوں کے خلاف ہے وہ گورنر جنرل کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہنے دیتی کہ وہ آئندہ کیلئے یہ درخواست کریں کہ دربار حیدرآباد کی خط کتابت اس سے زیادہ سنجیدگی اور ہوشمندی کے ساتھ ہونی چاہئے۔"[1]

فی الواقع یہ تنبیہ تھی بھی معقول، کیونکہ حق طلب کرنا، معاہدات کی پابندی پر زور دینا اور برسوں کے کھائے ہوئے مال کو اگلوانے کی کوشش کرنا، یہ سب کے سب نہایت غیر سنجیدہ اور غیر ہوشمندانہ افعال ہیں اور ان کا ارتکاب انگریز کے سوا کوئی اور کرے تو وہ اسکی شاہانہ قدر و منزلت اور مدبرانہ شان دونوں کے عین منافی ہے کیوں کہ دوسروں کے لئے تو یہی سزاوار ہے کہ اپنا مال دیں اور پھر پلٹ کر نہ مانگیں۔

ایک طرف سالار جنگ کو یہ جواب دیا گیا دوسری طرف ۱۴ فروری ۱۸۶۷ء

[1] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 656

کو سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ کرینبورن .... کے نام سالار جنگ کا خط ایک طویل نوٹ کے ساتھ بھیجا گیا اور انہیں لکھدیا گیا کہ

"ہم پوری احتیاط کے ساتھ تحقیقات کرکے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بیان کردہ قرضوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور چونکہ وہ سمجھتے جسکی رو سے برٹش گورنمنٹ نے زیر بحث مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے اسکی روح ہی یہ ہے کہ ہمارے پاس اُن مطالبات کو پورا کرنے کیلئے ایک ایسا مستقل ذریعہ آمدنی ہونا چاہئیے جو اس کے لئے کافی ہو، اسلئے ہم نے دربار کو مطلع کردیا ہے کہ ہم موجودہ تفویض پر اس میں کسی ترمیم کے فتح باب کی کوئی وجہ نہیں پاتے"۔ [۱]

اس کے جواب میں ۳۱ مئی ۱۸۶۷ء کو لارڈ اسٹیفرڈ نارتھ کورٹ سکریٹری آف اسٹیٹ نے لکھا کہ

"میں اس باب میں آپ کی رائے سے پورا اتفاق رکھتا ہوں کہ اس قرض کا کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کے متعلق دربار حیدرآباد نے بیان کیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ذمہ ہز ہائی نظام کی طرف سے واجب الادا ہے اور جس کو ہز ہائی نس نے اپنی موجودہ درخواست کی بنیاد قرار دیا ہے"

"اب رہا وہ دعویٰ جو متوقع انقراض ریاست میسور میں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ حصہ لینے کے متعلق نظام نے پیش کیا ہے تو برٹش گورنمنٹ یہ تسلیم ہی نہیں کرتی کہ علاقہ میسور میں نظام کچھ حقوق مستلزم الاستعارہ

---

[۱] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 648

کہتے ہیں تاہم سردست یہ کہدینا کافی ہے کہ سرسالارجنگ کے پیش کردہ دعاوی ایسے
مفروضات و قیاسات پر قائم کئے گئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں اسلئے ان پر بحث کرنا بالکل غیر ضروری ہے

اس طرح یہ معاملہ یہیں ختم کردیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد نواب مغفرت مکان افضل الدولہ بہادر کا انتقال ہوگیا۔ فروری ۱۸۶۹ء میں نواب میر محبوب علیخان بہادر تین سال کی عمر میں وارث تخت و تاج ہوئے۔ نواب سرسالارجنگ ان کے ایام نابالغی میں مختار ریاست بنائے گئے اور نواب شمس الامرا امیر کبیر کو شریک مختار بنایا گیا، شمس الامراء اور سالارجنگ کے خاندان میں پرانی مخالفت تھی لیکن دونوں ریاست کے خیرخواہ تھے اس لئے جہاں تک ریاست کے مفاد کا تعلق تھا دونوں ایک متفقہ پالیسی پر کاربند رہے اور استرداد برار کی طرف دونوں نے اپنی پوری توجہ صرف کی۔

۱۴ فروری ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا نے تفویض برار کے معاہدہ میں ترمیم و تنسیخ کا دروازہ کھولنے سے صرف اس بنا پر انکار کیا تھا کہ گورنمنٹ کو کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے ایک "مستقل ذریعہ آمدنی" کی ضرورت تھی۔ اس لئے سرسالارجنگ نے ایک "مستقل ذریعہ آمدنی" مہیا کرنے ہی کی طرف ساری توجہ منعطف کردی اور آخرکار اپنی اعلیٰ قابلیت سے انہوں نے ۹ کروڑ روپے کا انتظام کرکے ۱۹ ستمبر ۱۸۷۲ء کو دوبارہ مسئلہ برار کا افتتاح کیا اور گورنمنٹ کو لکھا کہ ہم کنٹنجنٹ کے مصارف کے لئے ۸۰ ملین پونڈ کی نقد رقم جمع کرا دیتے ہیں، اور اس طرح وہ "مستقل ذریعہ آمدنی" گورنمنٹ کے ہاتھ آجاتا ہے جسکی خاطر ملک برار سرکار نظام سے لیا گیا ہے۔ اگر کوئی نیک نیت حکومت ہوتی تو یقیناً اس تجویز کو منظور کرلیتی۔ کیونکہ ۸۰ ملین پاؤنڈ کا صرف سود ہی کنٹنجنٹ سالانہ مصارف

کے لئے کافی تھا۔ لیکن وہاں تو اصل مقصود کنیٹجنٹ نہ تھی ملکہ برار تھا۔ اس لئے ۲۴ ستمبر ۱۸۷۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری نے رزیڈنٹ کی معرفت یہ مختصر سا جواب دیدیا کہ "اول تو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کو قائم رکھنا یا بدل دینا تنہا حکومت حیدرآباد کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اس کے لئے دونوں حکومتوں کی رضامندی درکار ہے"۔ دوسرے مذکورۂ بالا دونوں معاہدوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ "کنیٹجنٹ کے مصارف کے لئے ارضی ضمانت (Territorial guarantee) مہیا کیجائے"۔ چھ سال پہلے تک انہی معاہدوں کی روح صرف یہ تھی کہ "مستقل ذریعہ آمدنی" برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہو مگر جب وہ "مستقل ذریعہ آمدنی" ہاتھ میں دینے کا بندوبست ہوگیا تو اب انہی معاہدوں کا بنیادی اصول یہ مقرر ہوا کہ "ارضی ضمانت" مہیا کیجائے ان حیلوں اور بہانوں کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کا بنیادی اصول محض ملک برار پر انگریزی تسلط تھا اور کنیٹجنٹ کی حیثیت شکاری کے جال کے سوا کچھ نہ تھی حکومت کے اس رویہ پر خود انڈین کونسل کے بعض ممتاز ارکان نے سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی اور سرجان کے (Sir John Kaye) نے تو یہاں تک لکھدیا کہ جو طرز عمل گورنمنٹ اختیار کررہی ہے اس نے ہندوستان کی تمام بڑی بڑی ریاستوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ جو پالیسی ہم نے اپنی کمزوری کے زمانہ میں اختیار کی تھی اسے اب ہم اپنی طاقتوری کے زمانہ میں بدل رہے ہیں اور آخر میں اس نے لکھا تھا کہ:۔

"اس روش میں سلطنت کے لئے شدید خطرات مضمر ہیں جن کو میں اپنے
بیس سال کے تجربہ کی بناء پر نمایاں دیکھتا ہوں" [۵۱]

لیکن یہ سب تنبیہیں بیکار تھیں حکومت برطانیہ کے ارباب حل وعقد کی نگاہ میں ملک برار کی قیمت ان نصائح کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔

حکومت ہند کے اس انکاری جواب پر ۲۴ر نومبر ۱۸۷۳ء کو سالار جنگ اور شمس الامراء نے رزیڈنٹ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے حکومت کے جواب پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگرچہ سرکار نظام کسی جائز معاہدہ کی بناء پر کنٹیجنٹ رکھنے کی پابند نہیں ہے۔ تاہم وہ برٹش گورنمنٹ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے اور صرف یہ چاہتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ باہمی اتفاق کے ساتھ اس امر پر غور کرے کہ "ارضی ضمانت" کے بجائے نقد مالی ضمانت کے قبول کرنے میں کیا قباحت ہے۔

اس مراسلہ کو کلکتہ کے دفتر سیاسیات نے اس طرح نذر تغافل کر دیا جیسے کہ وہ وصول ہی نہیں ہوا، اور ۹ ار مارچ ۱۸۷۴ء کو لارڈ سالسبری (وزیر ہند) سے یہ مختصر سا فیصلہ حاصل کر لیا کہ اضلاع کی مدت تفویض کو متعین کرنا تہا حکومت حیدرآباد کے اختیار میں نہیں ہے اور ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کا اصلی مقصد ارضی ضمانت حاصل کرنا تھا وزیر ہند کا یہ فیصلہ ۱۲ ار مئی ۱۸۷۴ء کو حکومت حیدرآباد کے پاس بھیج دیا گیا۔

اس کے جواب میں ۶ ر جولائی ۱۸۷۴ء کو سر سالار جنگ اور شمس الامراء

---

۵۱ Hyderabad Affairs Vol. II P. 383

نے ایک اور طویل مراسلہ بھیجا جو ۱۲۴ پیراگراف پر مشتمل تھا اور اس میں انہوں نے کنٹیجنٹ کی حقیقت، اس کے قرض کی اصلیت، اور ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی غیر قانونی نوعیت کو واضح کرنے کے بعد گورنمنٹ کو صاف طور پر مطلع کر دیا کہ محض برٹش گورنمنٹ کو خوش رکھنے کے لئے ہم اس کنٹیجنٹ کو برقرار رکھنے پر راضی تھے اور اس کے مصارف کیلئے ۸ ملین پونڈ کی رقم خطیر پیش کر رہے تھے لیکن اگر ہمارے اس فیاضانہ پیشکش کو رد کیا جاتا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ کرنل لو کے اس وعدہ پر اپنے مطالبات کو قائم کریں جو ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے وقت انہوں نے حکومت ہند کی جانب سے کیا تھا کہ "تفویض صرف اس وقت تک کے لئے ہے جب تک سرکار نظام کو کنٹیجنٹ کی ضرورت رہیگی"۔ لہٰذا اب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کنٹیجنٹ کی ضرورت نہیں ہے آپ اسے برطرف کیجئے اور ہمارا ملک ہمیں واپس دیجئے۔[1]

یہ برٹش گورنمنٹ کے غاصبانہ حیلوں کا اصلی جواب تھا۔ اور اس جواب کو صبر و سکون کے ساتھ سننا گورنمنٹ کی قوت ضبط سے باہر تھا کلکتہ کے صیغۂ خارجیہ نے اس مراسلہ کو دبا کر رکھ لیا وزیر ہند کو اس کی خبر تک نہیں کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایک آخری جواب دیکر اس معاملہ کو ختم کر دیں۔ چنانچہ حکومت ہند کی درخواست پر لارڈ سالسبری نے ۷ اپریل ۱۸۷۴ء کو سرسالار جنگ کے مطالبات کا یہ قطعی جواب دیدیا کہ نہ ملک برار

---

[1] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 358-359

واپس کیا جائے گا اور نہ کنٹنجنٹ کے لئے مالی ضمانت قبول کیجائے گی۔ یہ جواب سر سالار جنگ کے ۶ جولائی والے خط کے بعد اس کے علم کے بغیر لکھا گیا تھا، اور اس کے جواب میں بالکل بے معنی تھا لیکن رزیڈنٹ نے اس راز کو چھپانے کے لئے کہ یہ "قطعی فیصلہ" ۶ جولائی والے خط کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہے اسے ایک مہینے سے زیادہ عرصہ تک دبائے رکھا، اور ۲۱ اگست ۱۸۷۶ء کو امرائے حیدرآباد کی ایک دعوت کرکے اس میں سر سالار جنگ اور شمس الامراء کو زبانی اس فیصلہ کا خلاصہ سنا دیا اور صاف الفاظ میں یہ بھی کہدیا کہ اس فیصلہ کے بعد اب میں مسئلہ برار کے متعلق کوئی خط حکومت ہند کو بھیجنے کیلئے وصول نہیں کروں گا۔[1] سالار جنگ نے لارڈ سالسبری کے مراسلہ کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر رزیڈنٹ نے انکار کر دیا۔ دوسرے دن سالار جنگ نے سرکاری طور پر وزیر ہند کے مراسلہ کی نقل طلب کی مگر اسکا بھی وہی جواب تھا جو زبانی درخواست کا دیا جا چکا تھا اسپر سر سالار جنگ نے ۲۹ ستمبر ۱۸۷۶ء کو ایک پُرزور خط رزیڈنٹ کے نام لکھا جس میں انہوں نے صاف لکھدیا کہ

> "اس جواب کا مطلب تو یہ ہے کہ سرے سے یہ بحث ہی کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے کہ ہمارے دعاوی صحیح ہیں یا غلط اور انکی صحت و عدم صحت کا امتحان کئے بغیر ان کو زبردستی دبا دینے کی کوشش کیجا رہی ہے.... سکریٹری آف اسٹیٹ کا فیصلہ جس کو آخری فیصلہ کہا جا رہا ہے، ہمارے

---

[1] Hyderabad Affairs Vol. II P. P. 385-388

اصلی دعاوی اور دلائل کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہے اور در اصل وہ ہمارے اس خط کا جواب ہے جو ۶ جولائی والے خط سے پہلے بھیجا گیا تھا۔"

رزیڈنٹ نے سرسالار جنگ کے اس خط کو حکومت ہند کے پاس بھیجنے سے انکار کر دیا اور ۱۲ اکتوبر کو اسے ان الفاظ کے ساتھ واپس کر دیا کہ وائسرائے کی واضح ہدایات یہ ہیں کہ اب میں اس مسئلہ کے متعلق انہیں کوئی مراسلہ نہ بھیجوں۔ سرسالار جنگ نے ۱۵ اکتوبر کو پھر وہی خط رزیڈنٹ کے پاس بھیجا اور اسے لکھا کہ اس ریاست کی طرف سے جو فرائض مجھ پر اور میرے رفیق کار پر عائد ہوتے ہیں، وہ ایک ایسے فیصلہ کو "آخری فیصلہ" تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتے جو ہمارے دعاوی کے حسن و قبح کو جانچے بغیر بلکہ نفس دعاوی کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہو دوسرے دن رزیڈنٹ نے اس مراسلہ کو ایک نہایت خشمناک خط کے ساتھ سرسالار جنگ کے پاس واپس بھیجدیا جس میں لکھا تھا کہ

"اس طرح کا پیہم اصرار پرائیوٹ اور سوشل تعلقات میں بھی ایک لمحہ کیلئے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اور سرکاری معاملات میں تو اس سے کوئی اچھا نتیجہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا اس کا راست نتیجہ یہ ہوگا کہ ان عمدہ تعلقات پر برا اثر پڑے گا جو نظام کی نابالغی کے زمانہ میں حکومت ہند آپ سے اور امیر کبیر سے برقرار رکھنا چاہتی ہے۔"[۱]

ایک طرف اس طریقہ سے سرسالار جنگ کا منہ بند کیا گیا اور دوسری

---

[۱] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 387

طرف انگریزی حکومت نے اپنے اس قدیمی دوست کے اثر کو کم کرنے کے لئے سازش شروع کردی۔ سر سالار جنگ کو برطانی حکومت کا وفادار دوست اس بنا پر سمجھا جاتا تھا کہ ان سے برطانی حکومت کو یہ امید تھی کہ وہ اپنے ملک اور اپنے آقا کی سلطنت سے غداری کرینگے مگر جب انھوں نے ایک نمک حلال خادم دولت کی حیثیت سے اپنے آقا کے جائز حقوق طلب کرنے شروع کئے تو وہی سالار جنگ سلطنت برطانیہ کے دشمن ہو گئے۔ اور انگریزی حکومت نے ان کو اس طرح حیدرآباد کی حکومت سے نکالدینا چاہا جس طرح انگلی میں سے پھانس نکالدی جاتی ہے اس غرض کیلئے انگریزی رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس نے رزیڈنسی میں امرائے حیدرآباد کو کھانے کی دعوت دی، اس میں ان لوگوں کو خاص طور پر بلایا جو سالار جنگ کے سخت مخالف تھے۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ سالار جنگ اور شمس الامراء کو ان کی "نازیبا" حرکات سے باز رکھیں لیکن اس ریشہ دوانی میں مسٹر سانڈرس کو ناکامی ہوئی اور تقریباً تمام اکابر دولت نے اس کو یقین دلا دیا کہ برار کے مسئلہ میں وہ سب مختار الملک اور ان کے رفیق کے موید ہیں۔ یہی واقعہ ہے جس کی طرف سالار جنگ نے اپنے ۲۹ ستمبر ۱۸۷۴ء والے خط میں اشارہ کیا ہے کہ

"ہم یہ گمان بھی نہیں کرسکتے کہ اس ریاست کا کوئی وفادار خادم جو ہماری طرح اس دعوے کی قوت وصداقت کو محسوس کرچکا ہو اور ہماری سی ذمہ داری کا حامل ہو اعلیٰ حضرت کے متعلق اپنے فرائض کا احساس

رکھنے کے باوجود ہمیں یہ مشورہ دے گا کہ اس دعوے سے دست بردار

ہوجانا چاہئے۔[1]

سالار جنگ کو رزیڈنٹ کے رویہ سے معلوم ہوچکا تھا کہ انگریزی حکومت ان سے سخت ناراض ہے، مگر انہوں نے اس ناراضی کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی اور اپنے دعوے کو آگے بڑھانے کے لئے یہ غیر معمولی طریق کار اختیار کیا کہ ۷ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو براہ راست وزیر ہند کے پاس اپنے کاغذات بھیجدیے اور انہیں اس سے بھی مطلع کردیا کہ رزیڈنٹ اور حکومت ہند کے کس غیر معقول طرز عمل نے ان کو یہ غیر معمولی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے لارڈ سالبسری کم از کم اتنے بدتمیز نہ تھے کہ مسٹر سانڈرس کی طرح ایک مقتدر ریاست کے وزیر اعظم کے منہ پر ان کاغذات کو کھینچ مارتے۔ انہوں نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر کاغذات رکھ لئے اور حکومت ہند کو ہدایت کی کہ وہ سر سالار جنگ کے دلائل کا جواب دے اور خصوصیت کے ساتھ اس استدلال کا جواب دے کہ "صریح مواعید کی بناء پر کنٹنجنٹ کا برقرار رکھنا یا اسے برطرف کردینا نظام کی اپنی مرضی پر موقوف ہے" لیکن حکومت ہند کے پاس دلائل کا کچھ جواب نہ تھا۔ وہ غیر متعلق کاغذات بھیج بھیج کر وزیر ہند کا وقت ضائع کرتی رہی اور اصل بنیادی نکات کا جواب دینے سے احتراز کرتی رہی یہاں تک کہ پورا ایک سال گذر گیا اور سالار جنگ کو وزیر ہند کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار سر سالار جنگ نے اس قضیہ کو طے کرنے کیلئے انگلستان جانے کا

---

[1] میموآئیز صفحہ ۳۵۹

عزم کرلیا اور ۱۸۷۶ء میں وہ ملک کا انتظام اپنے رفیق کے سپرد کرکے خود یورپ روانہ ہوگئے۔ حکومت ہند کے لئے یہ ایک مشکل صورت حال تھی۔ سالارجنگ کو سفر سے روکنا اس کے اختیار میں نہ تھا اور یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ وزیر ہند کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کرکے اس معاملہ کو طے کرلیں اس لئے اس نے اس مشکل کا یہ حل تلاش کیا کہ سفر انگلستان میں سالارجنگ وزیر ہند سے برار کے متعلق کوئی گفت و شنید نہ کریں اور اس کے عوض رسمی مراسلت کے دروازہ کو کھولدیا جائے جو ۱۸۷۴ء میں رزیڈنٹ نے بند کردیا تھا چنانچہ اس سمجھوتہ کو قبول کرکے سر سالارجنگ نے انگلستان میں برار کے متعلق کوئی گفت و شنید نہیں کی اور واپس آکر دسمبر ۱۸۷۶ء میں اپنے دعاوی اور دلائل کے متعلق ایک مفصل بیان رزیڈنٹ کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے حکومت ہند کے پاس بھیجدے۔ لیکن رزیڈنٹ نے حسب سابق اس میموریل کو وصول کرنے سے انکار کردیا۔

جنوری ۱۸۷۷ء کے دربار میں جب سالارجنگ نواب میر محبوب علیخاں مرحوم کو لیکر دہلی گئے تو کلکتہ کے صیغۂ خارجیہ سے حکم آیا کہ جبتک سالارجنگ اور شمس الامراء دونوں اس مضمون کے اقرارنامہ پر دستخط نہ کردیں کہ وہ حکومت آصفیہ پر دولت برطانیہ کی سیادت کو تسلیم کرتے ہیں اس وقت تک دربار حیدرآباد کو شاہی اجتماع میں شامل نہ کیا جائے[1] اس کے ساتھ ہی

---

[1] سر سالارجنگ نے معاہدات کی بناء پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ دولت آصفیہ ایک آزاد و خود مختار ریاست ہے جس پر سلطنت برطانیہ کو حقوق سیادت حاصل نہیں ہیں بلکہ دونوں سلطنتوں کے تعلقات دوستانہ اتحاد پر مبنی ہیں۔ سر سالارجنگ نے دولتین کے تعلقات میں بین الملی قانون کے نفاذ پر بھی زور دیا تھا۔

ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ دولتین کے مابین نزاعی امور میں زیر ہند کے فیصلہ کو قطعی و آخری فیصلہ تسلیم کریں۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے سالار جنگ نے ان دونوں شرطوں کو منظور کر لیا تب جا کر انہیں دربار میں شرکت کی اجازت دی گئی اور ان کے اس میموریل کو قبول کیا گیا جسے ڈسمبر میں واپس کر دیا گیا تھا۔

اس کے چند مہینے بعد اپریل ۱۸۷۷ء میں شمس الامراء امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سالار جنگ کا زور توڑنے کے لئے انگریزی حکومت کو وہ موقع مل گیا جسکی وہ منتظر تھی سالار جنگ کی خواہش تھی کہ ایجنسی تنہا ان کے ساتھ مخصوص رہے اور سلطنت کے چاروں معین المہاموں کی ایک اگزکیٹیو کونسل بنا دی جائے لیکن رزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ اور وائسرائے لارڈ لٹن کے درمیان کچھ اور ساز باز ہو رہا تھا۔ کئی مہینے تک مواد تیار ہوتا رہا اور آخرہ ۲ ؍ اگست ۱۸۷۷ء کو سر رچرڈ میڈ نے سالار جنگ کو اطلاع دی کہ وائسرائے نے نواب وقار الامراء کو شریک مختار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سالار جنگ اور وقار الامراء میں شدید ذاتی عداوت تھی اور وہ ان سے ملکر کام نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے اس فیصلہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اس پر سر رچرڈ میڈ سیدھے وائسرائے کے پاس پہنچے اور وہاں سے واپس آکر انہوں نے ایک نیم سرکاری ذریعہ سے سالار جنگ کو مطلع کیا کہ وائسرائے سے پوری طرح اجازت لے لی گئی ہے۔ اب اگر آپ نے ان کے آخری و قطعی فیصلہ کو قبول نہ کیا

تو آپ کو گرفتار کرکے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ مدراس بھیجدیا جائے گا[۱]
اس دھمکی کے بعد مزید مقاومت کرنا سالار جنگ کے لئے ناممکن تھا۔ مجبوراً انہوں نے "فیصلہ" کے آگے سر جھکادیا اور ۲۹ ستمبر ۱۸۶۷ء کو وقار الامرا کو شریک مختار بنادیا گیا۔

یہ وہی سالار جنگ تھے جنکے متعلق ۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے مراسلہ میں لارڈ اسٹینلے نے بحیثیت وزیر ہند یہ حکم دیا تھا کہ ان کا نام غدر کے وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا جائے اور یہ وہی سالار جنگ تھے جن کے متعلق ۲۹ مارچ ۱۸۵۸ء کے ایک مراسلہ میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نے لکھا تھا کہ:۔

> "نظام کے وزیر نے جس بے دریغ مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ حکومت انگلشیہ کی اعانت کی ہے وہ تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔۔۔۔۔
> ہر خطرہ کے وقت میں ہماری علانیہ امداد کا تہیہ کرلینے سے وہ مسلمانوں میں سخت غیر مرغوب بلکہ قریب قریب خارج از ملت سے ہوگئے تھے مگر نہ کسی قسم کی ملامتیں اور دھمکیاں، اور نہ التجائیں اور استدعائیں ان کو اس سچی وفاداری کے راستہ سے ہٹا سکیں جو انہوں نے اول دن سے اختیار کیا تھا بیسیوں مرتبہ ان کے قتل کی سازشیں کی گئیں اور مجھے یقین ہے کہ خود ان کو ان سازشوں کا علم تھا مگر نہ تو جان کا خوف ان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکا اور نہ ان اطلاعات نے

---

[۱] Hyderabad Affairs Vol.II.P.392

انہیں تنزل کیا جو شمال مغرب سے ہماری شکستوں کے متعلق پیہم موصول ہو رہی تھیں۔ جب کبھی میں نے ان سے مدد طلب کی تو انہوں نے اسی استقلال اور یکدلی کے ساتھ اسکو پورا کیا اور حکومت نے نظام کے وسائل جہاں تک ان کے اختیار میں تھے، میرے لئے وقف رہے۔"

اس وفاداروں کے وفادار اور سرگرم مددگار کو آج گرفتاری اور جلاوطنی کی دھمکی دی جارہی تھی، اس پر الزام لگایا جارہا تھا کہ وہ وہابیوں کی سازش میں شریک ہے۔ افغانستان سے ساز باز کر رہا ہے، بغاوت کے لئے فوج تیار کر رہا ہے۔ خفیہ اسلحہ سازی کے سامان فراہم کر رہا ہے۔ انگریزی اخبارات کے کالم اس پر طعن و تشنیع کے لئے وقف تھے۔ اور خود وائسرائے لارڈ لٹن کو بھی یہ کہنے میں تامل نہ تھا کہ اس کے عہد حکومت میں سالار جنگ سب سے بڑا "خطرہ" تھا۔[۱] اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سالار جنگ نے اپنے آقا کے حق نمک کو ادا کرنے کے لئے انگریزی حکومت سے وہ ملک واپس طلب کیا تھا جسے وہ ہضم کر چکی تھی۔

چند الفاظ نواب وقار الامراء بہادر کے متعلق بھی کہنے ضروری ہیں جن کو اس موقع پر شریک مختار کے منصب کے لئے سب سے زیادہ "موزوں" اور "قابل" شخص قرار دیا جارہا تھا۔ یہ شمس الامرا امیر کبیر اول کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں جب کرنل ڈیوڈسن اور نواب سالار جنگ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو ان پر شبہ کیا گیا تھا کہ قاتل کی پشت پر ان کا ہاتھ ہے۔

---

[۱] تھارنٹن نے سر رچرڈ میڈ کی سوانحعمری میں لٹن کے اس خط کا حوالہ دیا ہے۔

۱۸۶۱ء میں ایک اور سازش کے سلسلہ میں ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا تھا اور سرکاری درباروں میں ان کا داخلہ تک بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۶۹ء کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ میں مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ ان کے متعلق لکھتا ہے کہ :۔

"۸ سال پہلے امیر کبیر کے بھائی نواب وقارالامرا ایک ایسی سازش میں شریک ہونے کے مجرم قرار دیئے گئے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود اپنے لئے وزارت کا منصب حاصل کریں۔ اس لئے حکومت عالیہ کے احکام کے ماتحت ان کو ہر ایسے پبلک اجتماع کے موقع پر (جس سے خود نظام کا دربار بھی مستثنیٰ نہ تھا) شریک ہونے سے روک دیا گیا جس میں برطانی حکومت کا نمایندہ موجود ہو۔ یہ حکم سزا سیاسی اعتبار سے کامل موت کا ہم معنی تھا[۱]"

چار پانچ سال پہلے تک جس شخص پر "سیاسی موت" طاری رکھی گئی تھی، اور جس کا سرکاری اجتماعات میں داخلہ تک بند تھا۔ اس پر اب عنایات شاہانہ و الطاف خسروانہ کی بارش ہو رہی تھی اور اس کے متعلق برطانی رزیڈنٹ امرائے حیدرآباد کے بھرے مجمع میں کہہ رہا تھا کہ "وہ ہمیشہ سے برٹش گورنمنٹ اور ہزہائی نس نظام کی حکومت کے درمیان دوستانہ تعلقات رکھنے کا خواہشمند رہا ہے۔

اس طرح سالار جنگ کو بے بس کرنے کے بعد ۲۸ مارچ ۱۸۷۵ء کو

---

[۱] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 360

لارڈ سالبسری کی جانب سے سالار جنگ کے اس میموریل کا جواب بھجوایا گیا جو انہوں نے جون ۱۸۷۶ء کو بھیجا تھا۔ اس جواب میں کنٹنجنٹ کے وجود اور اس کی برطرفی کے مسئلہ کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا گیا کرنل لو کی معرفت سرکار نظام سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس سے بھی کوئی بحث نہیں کی گئی اور تمام دلائل کا صرف یہ جواب دیا گیا کہ:۔

"اس وقت ان اسباب اور محرکات کے متعلق تحقیقات کرنا جو ۱۸۵۳ء کا معاہدہ کرنے والوں کے لئے باعث تحریک ہوئے تھے، فضول ہے۔ یہ واقعہ کہ اس پر دستخط کیے گئے، اور وہ ان لوگوں کیلئے واجب التعمیل ہے جنہوں نے اس پر دستخط کئے، صرف یہی ایک ایسا مادی واقعہ ہے جس سے ہز مجسٹی کو حکومت کو ایک جانب اور ہز ہائی نس کی حکومت کو دوسری جانب سروکار رکھنا چاہیئے۔"

مگر اس کھلی ہوئی صداقت کشی کے باوجود لارڈ سالبسری سر سالار جنگ کے مدلل دعوے کو کلیتہً رد کرنے کی جراءت نہ کر سکا اور اس نے صرف اس عذر کی بناء پر اس کو رد کیا کہ "اس قسم کے مسائل کو نظام کی جانب سے چھیڑنا ایسی حالت میں کچھ نامناسب سا ہے جب کہ خود نظام ابھی نابالغ ہیں" اور اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ اگر ہز ہائی نس امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ خواہش کرینگے کہ دولتین کے تمام ان معاملات پر جو از روئے معاہدہ طے ہوئے ہیں ایک عام نظر ثانی کی جائے تو برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس کی اس درخواست پر غور کرے گی"۔

اگرچہ یہ عذر بھی نہایت غیر معقول تھا جب والئی ملک کی نابالغی کے

زمانہ میں مختار ریاست تمام معاملات کا نگران ہوتا ہے تو اس کی جانب سے سیاسی مسائل کو طے کرنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے خود تاریخ انگلستان میں ریجنسی کے ایسے اہم معاملات طے کرنے کی مثالیں نادرالوجود نہیں ہیں، ایڈورڈ ششم کی نابالغی کے زمانہ میں نہایت اہم قانون کلیسا کی تدوین اور ۴ لاکھ کراؤں کے عوض بولون (Bologne) کی واپسی ہنری سوم کی نابالغی کے زمانہ میں میگنا کارٹا کی توثیق اور آخری ریجنسی میں ۱۸۱۴ء کے معاہدہ پیرس کے ذریعے مالٹا، ماریشس، سیلون اور جزائر غرب الہند کا انگریزوں کے ہاتھ آنا یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔ جب ایسے ایسے معاملات ریجنسی کے دور حکومت میں طے ہوسکتے تھے۔ تو حیدرآباد کی ریجنسی سے استرداد برار کے مسئلہ کو طے کرنا کیوں نامناسب تھا؟ تاہم یہی غنیمت ہے کہ لارڈ سالسبری نے لارڈ نارتھ بروک کی طرح گفت وشنید کا دروازہ بالکل بند نہیں کیا اور خود نظام کے لئے اس کی گنجائش رکھی کہ اس دروازہ کو کھٹکھٹا سکیں۔

نواب میر محبوب علی خاں مرحوم

نواب سالار جنگ مرحوم سالسبری کا یہ جواب سنکر اس امید پر خاموش ہوگئے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو

پہنچنے میں بھی اب کچھ زیادہ مدت نہ تھی، ان کو خیال تھا کہ جب حضور تخت نشین ہوں گے تو انگریزی حکومت کے لئے نابالغی کے عذر کی بھی گنجائش نہ رہے گی۔ لیکن قدرت انگریزی حکومت کے لئے پیہم کامیابی کے سامان مہیا کئے جارہی تھی۔ ابھی اعلیٰ حضرت مرحوم کی تخت نشینی میں ایک سال باقی تھا کہ ۱۸۸۳ء میں نواب سالار جنگ کا انتقال ہوگیا اور انگریزی حکومت کے کارندے اس کوشش میں لگ گئے کہ نواب کی تخت نشینی سے پہلے برار کے قضیہ کا ہمیشہ کے لئے قابل اطمینان فیصلہ کرلیا جائے۔ حیدرآباد کے چالاک رزیڈنٹ مسٹر کارڈری (Cordory) نے بعض نمک حرام امراء سے سازباز شروع کردیا اور ایک عہدنامہ کا مسودہ بھی طیار کرلیا۔ جس پر نوجوان بادشاہ سے دستخط لینے کا ارادہ تھا۔ ملبنٹ جو اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے حیدرآباد آیا تھا۔ اپنی مشہور کتاب ہندوستان بعہد رپن (Ripon) میں اس سازش کے متعلق لکھتا ہے۔

"ہم نے نہایت آزادی کے ساتھ سیاسی حالت پر گفتگو کی جو یہ تھی چند ہفتوں میں نظام سن بلوغ کو پہنچ جائیں گے اس کیلئے رزیڈنسی کی طرف سے یہ کوشش کیجارہی ہے کہ ان سے ایک معاہدہ پر دستخط حاصل کئے جائیں جس میں نظام اور حکومت ہند کے درمیان موجودہ اتحاد کی تجدید کے ساتھ ایک دفعہ اس قسم کی بھی ہے جو تمام پچھلے معاہدات کو

منسوخ کردیتی ہے۔ اور اس طرح صوبہ برار مستقل طور پر انگریزوں کے ہاتھ آجاتا ہے .... سید حسین (نواب عماد الملک مرحوم) یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ رزیڈنسی میں تیار رکھا ہے ان کو اس کی ایک نقل یا اس کا خلاصہ دکھایا گیا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ جب نظام سن بلوغ کو پہنچینگے تو یا تو اس معاہدہ کو ان کی تخت نشینی کے لئے لازمی شرط کے طور پر پیش کیا جائے گا یا اس سے پہلے ہی اس پر پیشکار کے دستخط لے لئے جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ کارروائی قانون کے مطابق کی جاسکتی ہے کیونکہ کونسل آف ریجنسی کو شاہی اختیارات حاصل ہیں اور کونسل جن لوگوں پر مشتمل ہے ان میں ایک تو ضعیف العمر اور غیر مستقل پیشکار ہیں دوسرے خود تخت کے امیدوار خورشید جاہ ہیں اور یہ دونوں رزیڈنسی کے اثر میں ہیں۔ تیسرے بشیر الدولہ ہیں جن کا کوئی خاص رنگ یا مضبوط کیرکٹر نہیں ہے۔ رہے نوجوان سالار جنگ (یعنی میر لائق علی خاں ابن سالار جنگ اول) سو وہ کونسل میں محض سکریٹری کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے کونسل کے فیصلوں میں ان کی آواز کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔"

بہت ممکن تھا کہ اس سازش کو کسی نتیجہ خیز حد تک پہنچا دیا جاتا، مگر اس وقت ہندوستان کا وائسرائے لارڈ رپن تھا جو نارتھ بروک اور لٹن سے مختلف ذہنیت کا آدمی تھا، اس لئے اس کے ماتحت روز روشن میں یہ بے ایمانی نہ کی جاسکی اور برار کا مسئلہ مزید بیس سال کے لئے ملتوی ہوگیا۔

اعلیٰ حضرت مرحوم نے مسند آرائے سلطنت ہونے کے بعد استرداد برار کے مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور انگریزی حکومت کے ساتھ غایت درجہ کی وفاداری کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے افغانستان اور مصر کے مسائل میں اپنی فوجی امداد انگریزی حکومت کو پیش کی۔ ۱۸۸۵ء میں جبکہ روس کا خطرہ بڑھ رہا تھا تو مرحوم نے سرحد کی حفاظت کے لئے ۶۰ لاکھ روپیہ اور ایک کثیر فوج سے حکومت کی مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو میں بذات خود میدان جنگ میں جاؤں گا۔

اعلیٰ حضرت کی اسی پیشکش سے امپیریل سروس ٹروپس کا تخیل پیدا ہوا ۱۸۹۲ء میں انہوں نے امپیریل گورنمنٹ کی مدد کے لئے ۸۰۰ سوار دن کا ایک رسالہ قائم کیا اور دسمبر ۱۹۰۰ء میں برٹش گورنمنٹ سے یہ سمجھوتہ کیا کہ جب کبھی میدان جنگ میں انکی فوج جائیگی تو وہ انگریزی افواج کے قائد اعلیٰ کے تحت رہیگی

اس وفاداری اور استرداد برار کے حق سے بے اعتنائی کا یہ انعام ملا کہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے خود مسئلہ برار کو چھیڑا، اور انہی جائز طریقوں سے جو پہلے ڈلہوزی اختیار کر چکا تھا، برار کا دوامی پٹہ حاصل کر لیا یہ کارروائی جس طریقہ سے عمل میں لائی گئی اس کی صحیح کیفیت ظاہر کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ۵۰ سال پہلے کے واقعات سے اس کا سلسلہ از سر نو جوڑا جائے۔

لارڈ کرزن کا دوامی پٹہ

۱۸۵۳ء میں جب تفویض برار کے معاہدہ کی گفتگو کا آغاز کیا گیا تھا تو

ابتداً حکومت برطانیہ کا مطالبہ یہ تھا کہ برار کو ہمیشہ کیلئے اس کے حوالہ کردیا جائے۔ ۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء کو لارڈ ڈلہوزی نے مجوزہ معاہدہ کا جو مسودہ کرنل لو کے نام بھیجا تھا اسکی دفعہ ۶ کے الفاظ یہ تھے۔

"مذکورۂ بالا حیدرآباد کنٹیجنٹ کے مصارف کی باقاعدہ ادائیگی کے لئے ہز ہائی نس نظام اس معاہدہ کے ذریعہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو دوامی طور پر وہ تمام اضلاع سپرد اور تفویض کرتے ہیں جن کے نام اس معاہدہ سے منسلک ضمیمہ میں دیئے گئے ہیں"

جب یہ مسودہ نواب ناصر الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے سب سے زیادہ جس چیز کی مخالفت کی وہ یہی "دوامی تفویض" تھی۔ اسکے خلاف آنکی ناراضی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ انگریزی سلطنت کی شدید دھمکیوں کے باوجود اسکو قبول کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کرتے رہے اور انگریزی رزیڈنٹ کو یقین ہو گیا کہ اگر اس پر زیادہ زور دیا گیا تو اعلحضرت معاہدہ ہرگز نہیں کریں گے تب اس نے "دوامی طور پر" کے الفاظ نکال دیئے اور اس شرط پر معاہدہ کیا کہ جب تک انہیں کنٹیجنٹ کی ضرورت رہے گی اس وقت تک برار انگریزی انتظام میں رہیگا۔ کرنل لو اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ۔

"میں نے جب دیکھا کہ لفظ "دواماً" (Imperpetuity) سے نظام کی ناراضی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے اس لفظ پر زیادہ اصرار کیا تو تمام گفت و شنید ہی ناکام ہو جائیگی تو میں نے یہ اعلان کیا کہ اس اسکیم کا یہ حصہ ایسا ہے جس کے متعلق میری حکومت نے

مجھے آزادی دی ہے کہ اگر ضروری ہو تو اسے بدل دوں اور میں نے باضابطہ (Formally) یہ اعلان کر دیا کہ اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع کنٹنجنٹ کی پرورش کی غرض سے محض اس وقت تک کے لئے تفویض کئے جاسکتے ہیں جب تک انہیں اسکی (یعنی کنٹنجنٹ کی) ضرورت رہے اور مزید براں میں نے کہا کہ اگر ہز ہائی نس مجھ سے یہ خواہش ظاہر کریں کہ وہ اس فوج کی ضرورت نہیں سمجھتے تو گورنر جنرل اسکو بتدریج تخفیف کر کے کلیتہً برطرف کر دینگے ...... اور جب یہ ساری فوج توڑ دی جائیگی جس میں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی تو نظام ان اضلاع کو اپنے انتظام میں واپس لے سکتے ہیں[۱]

اس طرح تفویض کے محض عارضی ہونے کا اطمینان دلا کر ۱۸۵۳ء میں برار پر قبضہ حاصل کیا گیا تھا جب یہ ابتدائی مرحلہ طے ہوگیا تو سات سال بعد اس مقصد کی جانب دوسرا قدم بڑھایا گیا ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ کی گورنمنٹ نے نواب افضل الدولہ سے خواہش ظاہر کی وہ ملک برار کو کمشنری ناگپور سے ملحق کرنے کی اجازت دیدیں اور ملک کی آمدنی میں سے منافع کا مطالبہ ترک کر دیں۔ سر سالار جنگ نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو تفویض برار کی بالکل وہی حیثیت ہو جائیگی جو بلاری کے علاقہ کی ہے[۲]۔ اور اس طرح "الحاق" اور "تفویض" میں کچھ فرق نہ رہیگا۔ اس معقول اعتراض کا حکومت ہند کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اسلئے اس نے تحریص واطماع سے کام نکالنے کی کوشش کی اور سرکار نظام کو رزیڈنٹ کی معرفت لکھا کہ:

---

[۱] Hyderabad Affairs Vol. II. P. 608

"گورنر جنرل باجلاس کونسل ان اضلاع کو کلیتہً نظام کے مقبوضات کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے اور برٹش گورنمنٹ کے کسی ضلع میں ان کو ضم کرنے سے احتراز کرتے ہوئے محض انتظامی آسانی اور خرچ کی کفایت کے لئے یہ چاہتے ہیں کہ انہیں کمشنر ناگپور کی نگرانی میں دیدیں اس طریقہ سے جوڈیشیل کمشنر کا عہدہ توڑ دیا جا سکے گا۔ اضلاع مفوضہ کے انتظام کے لئے دوسرا عملہ جو حیدرآباد میں رکھا جاتا ہے اسے بھی موقوف کیا جا سکیگا اور بہت سی تخفیف مصارف سے متعلق اصلاحیں عمل میں لائی جا سکینگی"۔[1]

لیکن اس اطماع کا بھی حضور نظام پر کچھ اثر نہ ہوا اور جب ان پر زیادہ زور ڈالا گیا تو انہوں نے صاف کہا کہ تم ہمیں ایسے امور کو قبول کرنے پر مجبور کرتے ہو جنکو ہم نہیں چاہتے، اور ملکۂ معظمہ کے اعلان کے باوجود تمہاری حکومت ہمارے ساتھ بھی وہی جابرانہ سلوک کرنا چاہتی ہے جسکی بدولت اس سے پہلے ہم سالہا سال تک مالی مشکلات میں مبتلا رہے ہیں۔[2] انگریزی حکومت تہیہ کر چکی تھی کہ سر جان میلکم کی پرانی اسکیم کے مطابق برار، ناگپور، ساگر اور نربدا کے علاقوں کو ملا کر ایک صوبۂ متوسط قائم کرے۔ اور یہاں طے ہو چکا تھا کہ اس جدید صوبہ کا پہلا لفٹننٹ گورنر حکومت ہند کے معتمد امور خارجہ مسٹر سیسل بیڈن کو بنایا جائے مگر جب دیکھا کہ نظام اس نقطہ پر اتنی سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں یا "تفویض و ترتیب کے بغیر اپنی مرضی و خوشی سے اسکو نہ چھوڑینگے"[3] تو حکومت ہند نے

---

[1] مسٹر بینگ ڈپٹی سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا مراسلہ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۳۸۰۹ صیغۂ خارجہ [2] کرنل ڈیوڈسن کا مراسلہ مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۰ء نمبر ۱۹ صیغۂ خارجہ
[3] ایضاً۔ " " " "

کسی دوسری فرصت کے لئے اس ارادہ کو ملتوی کر دیا اور بلا واسطہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے بجائے، بالواسطہ حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔

یہ بالواسطہ حصول مقصد کا طریقہ یہ تھا کہ آمد و خرچ کا حساب پیش کرنے کی شرط جو ۱۸۵۳ء میں نکالی گئی تھی، اڑا دی گئی اور حکومت کے لئے اس حق کو محفوظ کر لیا گیا کہ وہ برار کی آمدنی میں سے جتنا چاہے خرچ کرے۔ چنانچہ ۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو حکومت ہند کے صیغۂ خارجیہ کی جانب سے یہ تصریح کر دی گئی کہ:۔

گورنر جنرل باجلاس کونسل اس بات پر راضی ہیں کہ اضلاع مفوضہ کی آمدنی میں سے نظم و نسق کے مصارف اور وہ اخراجات جو اس پر عائد کئے گئے ہیں وضع کرکے جو کچھ رقم بچے وہ سرکار نظام کو ادا کر دے، مگر یہ رضامندی صرف اس مفاہمت پر ہے کہ اس مد میں برٹش گورنمنٹ کے لئے پھیلاؤ کی زیادہ سے زیادہ گنجایش رکھی جائے گی۔ اور ان اضلاع کے نظم و نسق کے لئے تمام وہ اخراجات جنہیں گورنمنٹ کے عہدہ دار مناسب اور ضروری سمجھیں گے۔ انہیں قبل اس کے کہ کوئی فاضل باقی سرکار کو ادا کیا جائے اس میں وضع کر لیا جائے گا اور سرکار نظام کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا اور اگر ایک سال آمدنی سے خرچ زیادہ ہونے کے باعث گھاٹا آیا تو اسے دوسرے سال کی بچت سے پورا کر لیا جائے گا“[1]

اس شرط کو سرکار نظام نے طوعاً کرہاً منظور کر لیا اور ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی دفعہ

---

[1] مسٹر بینگ کا مراسلہ نمبر ۵۰۶ صیغۂ خارجہ

چہارم میں یہ بات طے کر لی گئی کہ:۔[1]

"اخراجات کی مقدار کلیتہً برٹش گورنمنٹ کے اختیار تمیزی پر منحصر رہیگی"

اس شرط کو منظور کرا لینے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ برار کے خزانہ سے جہانتک ممکن ہوگا نظام کو بجت کا ایک پیسہ نہ دیا جائیگا۔ معاہدہ طے ہوتے ہی دوسرے سال سے کنٹیجنٹ کے اخراجات تقریبًا دو گنے کر دیئے گئے۔ ڈلہوزی کے زمانہ میں سے صرف ۲۰ لاکھ سالانہ خرچ کئے جاتے تھے اب ان کو بڑھا کر ۴۱ لاکھ کر دیا گیا (حالانکہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان ۲۴ لاکھ سے زیادہ نہ تھے) نظم و نسق کے مصارف ۲۵ فی صدی سے بڑھکر ۳۲ فی صدی ہوئے، پھر ۵۰ فی صدی اور آخر ۵۶ فی صدی تک ان کو پہنچا دیا گیا۔ ۷۷۰۰ مربع میل رقبہ اور ۲۰۹۰۰۰ کی آبادی رکھنے والے صوبہ کا عملہ اس زمانہ میں صوبہ مدراس کے برابر تھا جسکی آبادی ۳ کروڑ ۸۲ لاکھ تھی اور جس کے حدود ڈیڑھ لاکھ مربع میل پر محیط تھے۔ اس چھوٹے سے صوبہ کو ۶ اضلاع پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر ضلع میں ایک کلکٹر ۵ امدادگار اور ۲۰ زائد مددگار رکھے گئے تھے اور اسی نسبت سے دوسرے محکموں میں بھی انتہا درجہ کی دریا دلی کے ساتھ فضول عملہ رکھا گیا تھا جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یار وفادار کو اسوقت تک ایک پیسہ نہ ملے جبتک وہ اپنے ملک کو کمشنری ناگپور سے ملحق کرنے پر راضی نہ ہو جائے۔

برار کی آمدنی ۱۸۶۰ء تک ۳۲ لاکھ تھی دوسرے سال ۴۰ لاکھ ہو گئی۔ ۱۸۸۰ء میں ۷۳ لاکھ ہوئی اور ۱۸۹۵ء میں ایک کروڑ تک پہنچ گئی لیکن اتنی

[1] Aitchison Vol. lx P. 105

حیرت انگیز توفیر کے باوجود سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک جو بچت کی رقم سرکار نظام کے لئے نکالی گئی اس کا اوسط ۹ لاکھ سے زیادہ کبھی نہ بڑھا بلکہ ۱۸۹۲ء اور ۹۷ء کے درمیان تو صرف ۷ لاکھ کا اوسط رہا اور ۱۸۹۷ء میں ایک پائی کی بھی بچت نہ نکالی گئی۔ پھر مزید یہ کہ برار کی آمدنی میں ۵۰ لاکھ کی ایک رقم خطیر اتفاقی ضروریات کے لئے محفوظ بھی کر لی گئی، حالانکہ اسے ملک کے اصل مالک کے خزانہ میں پہنچنا چاہیئے تھا۔

۱۸۹۷ء میں جب برار کی نئی جمعبندی ہونے والی تھی اور یہ امید تھی کہ اس میں اس صوبہ کی آمدنی ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ہو جائیگی۔ تو یہ تجویز پیش کیگئی کہ کنٹنجنٹ کے مصارف ۳۵ لاکھ اور نظم و نسق کے مصارف ۵۰ لاکھ رکھ کر سرکار نظام کے لئے ۳۱ لاکھ کی بچت نکالی جائے لیکن اس تجویز کو انگریزی حکومت کے سرکاری حلقوں میں سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اور یہ تجویز جہاں سے نکلی تھی وہیں دفن ہو گئی۔

ان پیہم حق تلفیوں پر جب سرکار نظام کی طرف سے شکایت کیگئی تو مئی ۱۸۹۹ء میں لارڈ جارج ہیملٹن (وزیر ہند) نے اس طرف توجہ کی اور حکومت ہند کو لکھا کہ :۔

"میں اس صورت حال کو قابل اطمینان نہیں سمجھ سکتا اور یور ایکسلنسی کی حکومت کی خاص توجہ کے لئے اس معاملہ کو بدیں غرض پیش کرتا ہوں کہ کفایت شعاری کی ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو برار کی مالی پوزیشن کو ایسی بنیاد پر قائم کرنے کے لئے قابل عمل پائی جائیں جس سے

نظام کو ادا کرنے کے لئے مخارج پر مداخل کی کافی زیادتی نکل آئے
اس کے جواب میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ نے ایک طویل رپورٹ
بھیجی جس کا خلاصہ یہ ہے :-

"دونوں حکومتوں کے مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ ان شرائط پر از سر نو غور
کیا جائے جن کے ماتحت برار کا موجودہ انتظام ہو رہا ہے تاکہ ہز ہائی نس
نظام کو ان کے ان اضلاع سے جو ہماری تفویض میں ہیں اس سے زیادہ باقاعدہ
اور معین آمدنی دی جائے جتنی موجودہ معاہدہ کے ماتحت دی جانی ممکن ہے
اس معاملہ میں معاہدہ کی شرائط کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ مگر معاہدہ
خود ہی ایسا ہے کہ نظم و نسق میں کسی کفایت شعاری کا موقع نہیں دیتا
اور زیادہ بچت نکالنے سے روکتا ہے۔ اب تک بڑی سے بڑی رقم
جو کسی ایک سال میں ہز ہائی نس کو دی گئی ہے وہ ۱۸۷۷-۷۸ء میں
۱۹۷۳۰۰۰ کی رقم تھی چند سال ایسے بھی گذرے ہیں جن میں کوئی
بچت ہی نہیں نکلی۔ اوسطاً ۱۸۶۱ء سے ۱۹۰۰ء تک قریب قریب
۹ لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم سرکار نظام کو دی گئی ہے۔ زیادہ قریبی زمانے
میں تو ایسے حالات پیش آ گئے ہیں کہ آئندہ چند سال کے لئے بچت
نکالنے کا موقع ہی نہیں رہا بہرحال صاف ظاہر ہے کہ چالیس سال سے
برار ریاست حیدرآباد کے لئے محض ایک غیر معین اور گھٹتی بڑھتی
آمدنی کا ذریعہ رہا ہے۔ اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اس
صورت حال میں کسی قسم کا تغیر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر نظام ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کو بدلکر حکومت ہند کی مرضی کے مطابق دوسرے انتظام کرنے پر راضی نہ ہونگے تو جس طرح چالیس سال سے ان کو غیر معین اور گھٹتی بڑھتی" آمدنی ملتی رہی ہے۔ اسی طرح آئندہ بھی بس ایسی ہی ملتی رہیگی، بلکہ آئندہ اتنی بھی ملنے کی امید نہیں ہے! ایک طرف قحط کے باعث سرکار نظام کی مالی حالت خود خراب ہو رہی تھی، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی نے اسکو سخت پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا اور اسے ۲ کروڑ کے قریب قرض لینا پڑا تھا دوسری طرف وہ پرانا دوست جسکی مدد کے لئے نواب میر محبوب علی خاں مرحوم نے ۶۰ لاکھ روپیہ کی رقم اپنی رعایا کی اور بوقت ضرورت خود اپنی جسمانی خدمات کے ساتھ پیش کی تھی، ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں تمہارے ملک کے سب سے زیادہ زرخیز صوبہ سے تم کو اس شدید ضرورت کے موقع پر اس وقت تک ایک پیسہ نہ دونگا جبتک تم میری ان شرائط کو نہ مان لوگے جنہیں تمہارے والد نے چالیس سال پہلے نا منظور کیا تھا اس سے زیادہ احسان شناسی، شرافت اور آدمیت اور کیا ہو سکتی تھی؟ پہلے یہی اخلاقی فضیلت دوست پر فوجی حملہ کی دھمکی کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ اب زمانہ بدل چکا تھا اس لئے وہی چیز اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ دوست کو شدید مالی مشکلات میں مبتلا کر کے اپنی شرائط ماننے پر مجبور کیا گیا۔

یہ نازک حالت تھی جس میں برار کی آمدنی کے مسئلہ کو طے کرنے کیلئے سرکار نظام نے سنہ ۱۹۰۱ء میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا جو چند مہینہ تک

چلتا رہا۔ آخر ۱۹۰۲ء کے اوائل میں لارڈ کرزن نے خود حیدرآباد جا کر اس کو طے کرنے کا قصد کیا اور ۳۰ مارچ کو اعلیٰ حضرت مرحوم سے وہ تاریخی ملاقات کی جس کا نتیجہ ایک سمجھوتہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سفر کا مقصد خود لارڈ کرزن ہی نے اپنے ۱۳ نومبر ۱۹۰۲ء کے ایک مراسلہ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

امتداد زمانہ سے یہ (۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے) طے کئے ہوئے معاملات غیر مناسب بھی ہو گئے تھے اور فرسودہ بھی اور اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی نزاعات بھی پیدا کرتے رہتے تھے...... گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب موجود الوقت انتظام کی خرابی یہ تھی کہ معاہدات کے تحت صوبہ کا فوجی و دیوانی نظم و نسق ناقص اور مسرفانہ تھا اور ہز ہائی نس کی جانب تغیر کی خواہش فاضل باقیات کی اس غیر معین اور ناپائدار حالت سے پیدا ہوئی تھی جس کی بے ضابطگی اور پراگندگی ریاست کے مالیات میں بے ثباتی کا افسوسناک عنصر پیدا کر رہی تھی۔"

آگے چل کر لارڈ کرزن کہتا ہے کہ اس عقدہ کا حل اس نے یہ سوچا تھا کہ ان انتظامی دشواریوں کو ایسے طریقے سے دور کیا جائے جس سے "ہز ہائی نس نظام کو ان کی مملکت کے اس خطہ سے ایک معین آمدنی حاصل ہو سکے اور برار کی ۲۸ لاکھ آبادی کے لئے ان حالات اور مراتب کے استمرار کا اطمینان کر لیا جائے جن سے وہ خوشحالی کے بلند درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔" ان حالات اور مراتب کا استمرار دوسرے الفاظ میں برٹش

گورنمنٹ کے قبضہ و تصرف کا استمرار تھا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر لارڈ کرزن نے گفت و شنید کا آغاز کیا اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ برٹش گورنمنٹ کا برار کا دوامی پٹہ اس شرط پر دیدیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے اس کا انتظام کرے اور اسکے عوض ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا مستقل خراج سرکار کو دے اول اول اعلیٰ حضرت مرحوم نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کیا اور برار کی واپسی پر زور دیا۔ مگر جب لارڈ کرزن نے انہیں یقین دلادیا کہ برار ہرگز واپس نہ کیا جائیگا اور ۱۸۶۰ء کی شرائط پر قائم رہنے سے وہ برار کی آمدنی کا بھی فائدہ نہ اٹھاسکیں گے تو مجبوراً انہوں نے لارڈ کرزن کی اس تجویز کو قبول کرلیا اور ۵ نومبر ۱۹۰۲ء کو فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جس کی دفعات حسب ذیل تھیں :۔

دفعہ اول :۔ ہز ہائی نس نظام جن کے شاہی حقوق اضلاع مفوضہ برار از سر نو تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان اضلاع کو دوامی پٹہ پر برٹش گورنمنٹ کے حوالہ کرتے ہیں جس کے عوض برٹش گورنمنٹ ان کو ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا معین اور مستقل خراج ادا کریگی۔

دفعہ دوم ۔ حکومت برطانیہ اضلاع مفوضہ میں اس مکمل اور غیر مشترک قبضہ و اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے جو اسے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی رو سے حاصل ہیں اس امر میں آزاد ہوگی کہ بلالحاظ ان معاہدات کی خلاف ورزی کے اضلاع مفوضہ کا ایسے طریقے سے انتظام کرے

جسے وہ پسند کرتی ہو، نیز یہ کہ ان افواج کو جو حیدرآباد کنٹیجنٹ کے نام سے قائم ہیں جس طرح مناسب سمجھے از سر نو تقسیم کرے، تخفیف کرے، تنظیم کرے اور نگرانی کرے، البتہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۳ میں ہز ہائی نس کے متعلقات کی حفاظت کا جو اقرار اس نے کیا ہے اسے جیسا کہ واجب ہے پورا کرنے کا بندوبست کرے۔" [۱]

اس مختصر سے معاہدہ کے ذریعہ لارڈ کرزن نے صرف یہی فائدہ نہیں اٹھایا کہ برار کا دوامی پٹہ حاصل کر لیا جو پچاس سال پہلے باوجود "دھمکیوں اور بھبکیوں" (Objurgations & threats) حاصل نہ ہو سکا تھا۔ بلکہ برار کو ناگپور کی کمشنری سے ملحق کر کے ایک صوبہ متوسط بنانے کی تمنا بھی پوری کر لی جیسے ۱۸۶۰ء میں نواب افضل الدولہ نے رد کر دیا تھا اور حیدرآباد کنٹیجنٹ کو توڑ دینے کا بھی اختیار حاصل کر لیا حالانکہ اسی فوج کی خاطر صوبہ برار سرکار نظام سے حاصل کیا گیا تھا اور اس فوج کو توڑ دینے کے بعد اس صوبہ پر انگریزی قبضہ رہنے کی کوئی معقول کیا معنی نامعقول وجہ بھی نہ تھی۔ ایسے عظیم فوائد کے مقابلہ میں انگریزی حکومت نے صرف ۲۵ لاکھ سالانہ کی رقم پیش کی، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس میں سے بیس سال تک ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ برار کے قرضوں (Berar loans) میں اور ایک غیر متعین مدت تک ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ حیدرآباد کے قرضوں (Hyderabad loan) میں وضع کیا جاتا رہے گا اور سرکار نظام کو ان کے سب سے زیادہ زرخیز صوبہ سے صرف ساڑھے چھ لاکھ روپیہ سالانہ ملیگا۔ بعد میں سرکار نظام کی درخواست پر اس شرط

---

[۱] Aitch ison's Treaties IX. P. 175

میں تھوڑی سی ترمیم ہو گئی جس کے مطابق ایسا انتظام ہو گیا کہ ۲۵ لاکھ کی پوری رقم تیس سال بعد سرکار نظام کو ملنی شروع ہو جائے گی چنانچہ ابھی اس وقت کے آنے میں چند سال باقی ہیں۔

یہ معاہدہ تو بیشک ہوا اور سرکار نظام نے اسکی تصدیق بھی کی، لیکن سوال یہ ہے کہ قانونی حیثیت سے یہ کہاں تک ایک جائز معاہدہ تھا؟ اس کے لئے حسب ذیل امور قابل غور ہیں:۔

(۱) اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم برار کا دوامی پٹہ لکھنے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے۔ جس وقت یہ تجویز ان کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اور امراء و اعیان سلطنت کی کونسل نے بالاتفاق اس کی مخالفت کی اور ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء کو سب کے مشورہ سے اعلیٰ حضرت مرحوم کی جانب سے ایک خط لارڈ کرزن کے نام لکھا گیا جسے خود مرحوم اپنے ہاتھ سے پیش کرنیوالے تھے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ:۔

"میں اس پرانے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ استرداد برار کے لئے میرے حقوق کیا ہیں یا اسکے متعلق معاہدات اور دوسرے سرکاری عہود و مواثیق کے معنی کیا ہیں۔ میں پورے بھروسہ کے ساتھ ان معاہدات کو یور اکسلنسی کی توجہات کریمانہ و مشفقانہ پر چھوڑتا ہوں۔ میں آپکے توسط سے ہز میجسٹی شہنشاہ معظم کی خدمت میں صرف یہ گذارش کرونگا کہ وہ لطف و کرم کی ایک خاص علامت کے طور پر برار واپس کر دیں اور میں یہ اجازت چاہونگا کہ یور لارڈ شپ کو اس معاملہ میں اپنا وکیل بناؤں۔ میں پورا یقین رکھتا ہوں اور مجھے

کامل بھروسہ ہے کہ میری یہ گذارش ہز مجسٹی کی تاج پوشی کے مبارک موقع پر رائیگاں نہ جائیگی۔"

(۲) اعلیٰ حضرت مرحوم اپنے اس مطالبہ سے ہٹکر دوامی پٹہ کی تجویز کو قبول کرنے پر صرف اس وقت راضی ہوئے جب لارڈ کرزن نے انکو پورے زور کے ساتھ یہ یقین دلادیا کہ پچھلے معاہدات کی رو سے انکو برار کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر وہ ایسا کرینگے بھی تو اسے ہرگز نہ قبول کیا جائیگا۔ معاہدہ کی گفت وشنید کے متعلق لارڈ کرزن نے جو نوٹ لکھا تھا اس میں وہ خود کہتا ہے:۔

"میں جب سنا کہ ایسی صریح فائدہ مند شرائط ہز ہائی نس کو پسند نہیں آئیں تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اگر ان شرائط کو رد کردیا گیا تو حکومت ہند پھر موجودہ پوزیشن کی طرف رجوع کریگی جس کے لیے کوئی مدت متعین نہیں ہے اور جس میں ہم پچاس سال سے نسبتۃً بہت کم مالی معاوضہ دیکر اس شے سے استفادہ کررہے ہیں جو در اصل مقصود بالذات ہے اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی جسکی بناء پر مجھے موجودہ تجاویز کے ناکام ہونے پر افسوس کرنا چاہئے۔ اگر ان کو رد کردیا گیا تو یہ حد درجہ غیر متوقع ہے کہ میرے بعد آنے والا کوئی وائسرائے اس سوال کو دوبارہ چھیڑیگا یا برطانیہ کی کوئی حکومت اپنی بات کو دوبارہ رد کرانا پسند کریگی۔ اسلئے ہز ہائی نس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تصفیہ کا جو موقع اب ان کو دیا جارہا ہے اس کے دوبارہ پیش کئے جانے کی توقع نہیں ہوسکتی اور یہ کہ ایسی صورت میں معاملات کی موجودہ ترتیب

ہی ایک دائمی صورت اختیار کر لیگی۔

"مگر انہوں نے (یعنی نظام نے) یہ معلوم کرنے کی خواہش کی کہ آیا جدید تصفیہ میں انہیں آزادی باقی رہیگی کہ آئندہ کسی وقت وہ برار کی واپسی کا مطالبہ کریں؟ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ اگر برار دوامی پٹہ پر برٹش گورنمنٹ کو دیدیا گیا تو ہز ہائی نس کیلئے ایسی کوئی درخواست کرنے کا موقع نہ رہیگا کیونکہ اسوقت صوبہ کی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی پٹہ کے ذریعہ ہو چکا ہوگا۔ پھر ہز ہائی نس نے پوچھا کہ آیا موجودہ حالات میں اس کا کوئی امکان ہے کہ برار ان کو واپس دیدیا جائے؟ میں نے جواب دیا کہ معاہدات میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے استرداد برار کا تصور کیا جاسکے یا جس سے حیدرآباد کو استرداد کا کوئی حق پہنچتا ہو...... برٹش گورنمنٹ کے لئے مجوزہ شرائط کا بدل اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اس دوامی تعریض پر قائم رہے جو پہلے ہی سے از روئے معاہدات اس کو حاصل ہے۔ تب ہز ہائی نس نے کہا کہ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ مجھے برار واپس ملنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے لہذا مجھے مجوزہ دوامی پٹہ لکھ دینے میں کوئی تامل نہیں ہے کیونکہ وہ ریاست کے مفاد کیلئے زیادہ اچھا ہے اب تک میں اسکو صرف اسلئے نامنظور کر رہا تھا کہ میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ آئندہ مجھے برار واپس ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

خود اعلیٰ حضرت مرحوم نے بھی اس ملاقات کی کیفیت لکھتے ہوئے اپنے نوٹ میں صاف لکھا ہے کہ:۔

"وائسرائے نے مجھ سے دوبارہ سہ بارہ کہا کہ برار کبھی واپس نہیں دیا جاسکتا ہز اکسلنسی نے کہا کہ میں یور ہائی نس کو کسی غلط امید میں نہیں رکھنا چاہتا

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ محض میری ہی نہیں بلکہ تمام وائسرائیوں کی جو میرے بعد آئیں گے یہی پالیسی ہوگی، اور انگلستان میں بھی حکومت کی یہی پالیسی ہوگی جو کہ برار کبھی کسی زمانہ میں واپس نہ کیا جائے۔" وائسرائے کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ گذشتہ ۲۵ سال کے درمیان برار کی واپسی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی گئی اس لئے اب یہ ہمارے لئے ناممکن ہے کہ اسے واپس حاصل کر سکیں اور اب ہمیں اسکی واپسی کی کوئی امید نہ کرنی چاہیئے ہز ایکسلنسی نے بیان کیا کہ "اگر موجودہ صورت حال برقرار رکھی گئی تو اس سے آپ کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، جب برار کو واپس کرنا ناممکن ہے تو موجودہ حالت کو برقرار رکھنا خلاف عقل ہے اس سے بہتر ہے کہ اس کو پٹہ پر دیدیا جائے اور اسکے عوض سال بہ سال روپیہ لے لیا جائے۔" تاہم میں نے کوشش کی جہاں تک میں کر سکتا تھا کہ واپسی پر اصرار کروں مگر وائسرائے کے جوابوں کا انداز دیکھکر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ہمکو برار واپس نہیں دینگے۔ یہ پچھلی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کو اس صوبہ سے ہاتھ دھونا پڑا، اسوقت میں یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ اگر یہ صورت ہے تو اسے پٹہ پر لے لیجئے۔

فریقین کے ان بیانات کو پڑھ لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے نے سنہ ۱۸۵۳ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی یہ تعبیر کی کہ ان سے برٹش گورنمنٹ کو برار کی دوامی تفویض (Perpetual assignment) پہلے سے حاصل ہے اور نظام کا حق استرداد ان معاہدات کی رو سے کلیتہً زائل ہوچکا ہے۔ اگر وائسرائے سابقہ معاہدات کی یہ تعبیر کرکے اعلیحضرت مرحوم کو یہ قطعی یقین نہ

دلا دیتا کہ برار کے واپس دیئے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو خود والسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق اعلیٰ حضرت مرحوم دوامی پٹہ کو ہرگز قبول نہ کرتے۔

(۳) سابقہ معاہدات اور حکومت برطانیہ کی سرکاری تصریحات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ والسرائے کی یہ تعبیر بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعہ تھی۔ تفویض برار کے پہلے معاہدہ کے وقت حکومت ہند کے وکیل مختار کرنل لو نے نواب ناصر الدولہ مرحوم کو یہ یقین دلایا تھا کہ:۔

"اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع کنٹیجنٹ کی پرورش کی غرض سے محض اس وقت تک کے لئے تفویض کئے جا سکتے ہیں جبتک انہیں اسکی ضرورت ہے...... جب (ہز ہائی نس کے خواہش کرنے پر) یہ ساری فوج توڑ دی جائے گی جس میں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی تو نظام ان اضلاع کو اپنے انتظام میں واپس لے سکتے ہیں۔"[1]

اس کے بعد ۵ ستمبر ۱۸۶۰ء کو حکومت ہند کی جانب سے یہ یقین دلایا گیا کہ

"مفوضہ اضلاع کے ایک حصہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے حکومت ہند کا مقصد صرف یہ ہے کہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ششم کی شرائط کو پورا کرنے کیلئے وہ ایک مادی ضمانت اپنے پاس رکھے گورنمنٹ آف انڈیا نے جس طرح ابتک تمام اضلاع مفوضہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اسی طرح اب بھی وہ اس علاقہ کو اپنی ملکیت میں نہیں بلکہ ہز ہائی نس کی طرف سے اپنی "امانت" (In trust) میں صرف اس وقت تک کیلئے رکھنا چاہتی ہے جب تک

---

[1] دیکھو کرنل لو کا مراسلہ مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۵۳ء نمبر ۱، صیغہ خارجہ

کنٹنجنٹ رکھی جائے اس سے زیادہ عرصہ کے لئے وہ نہیں رکھنا چاہتی۔۔۔

۔۔۔۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہز ہائی نس کے مقبوضات کے اس حصہ کا انتقال محض عارضی (Temporary only) ہے۔۔۔۔ جب کبھی اضلاع زیر بحث نظام کو واپس کئے جائیں گے تو ہز ہائی نس ان تمام فوائد سے متمتع ہو سکیں گے جو برطانی افسروں کے زیر انتظام رہنے کے زمانہ کی ترقیات سے ممکن ہے کہ آئندہ پیدا ہوں۔"[۵۱]

اس کے بعد ۲۶ دسمبر ۱۸۶۰ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی دفعہ ۶ میں بصراحت یہ لکھا گیا تھا کہ

"اضلاع واقع برار جو پہلے ہی معاہدہ ۱۸۵۳ء کے ماتحت برٹش گورنمنٹ کو تفویض کئے جا چکے ہیں معہ ان متعلقہ جات مزخاص کے جو ان میں واقع ہیں اور معہ ان مزید اضلاع متصلہ کے جو بحالت موجودہ ۳۲ لاکھ روپیہ سکہ حکومت برطانیہ کی سالانہ آمدنی دینے کے لئے کافی ہوں۔ برٹش گورنمنٹ کے پاس امانتاً (In trust) رہیں گے تاکہ ان سے حیدرآباد کنٹنجنٹ کی تنخواہیں اور آپا دیسائی کی چوتھ، مہیت رام کے خاندان کا سالیانہ اور چند دیگر پنشنیں جنکا ذکر عہد نامہ مذکور کی دفعہ ششم میں کیا گیا ہے، ادا کی جائیں۔"[۵۲]

اس کے بعد ۵ جنوری ۱۸۶۱ء کو لارڈ کیننگ (وائسرائے) نے سر چارلس ووڈ (وزیر ہند) کو جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں وہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے۔

---

۵۱ دیکھو مسٹر بینگ ڈپٹی سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا مراسلہ نمبر ۳۰۸۹ صیغہ خارجیہ

۵۲ Aitchison Vol. IX P.

"نظام کو بتایا گیا کہ حکومت ہند اضلاع مفوضہ کو اپنی ملکیت میں نہیں بلکہ اپنی "امانت" میں رکھنا چاہتی ہے اور صرف اس وقت تک رکھنا چاہتی ہے جب تک کہ کنٹنجنٹ رکھی جائے نہ کہ اس سے زیادہ...... ان سے کہا گیا کہ اضلاع برار اب بھی ہز ہائی نس کے مقبوضات کا ایک غیر منفک جز ہیں۔ اور وہ ان کو اس وقت یہ تمام واپس کر دیئے جائیں گے جب دونوں حکومتوں کو یہ مناسب معلوم ہوگا کہ اس قرار داد کو بدل دیں جنکے ماتحت کنٹنجنٹ رکھی گئی ہے۔"[۱]

اس کے بعد سر سالار جنگ کے پیہم مطالبات کے جواب میں ۲۸ مارچ ۱۸۷۸ء کو جو "آخری اور قطعی" فیصلہ لارڈ سالسبری نے وزیر ہند ہونے کی حیثیت سے صادر کیا تھا، اس میں بھی یہ تصریح موجود تھی کہ :۔

"یہ بالکل ظاہر ہے کہ معاہدہ میں برار کو قطعی طور پر حوالہ نہیں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی ایسا ہی انتظام چاہتے تھے مگر اس پر نظام کو ایسے اعتراضات تھے جنکو انکے ذہن سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسے قبول کرنے پر نہیں مجبور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر تفویض قطعی ہوتی تو ملکیت یہ تمام تاج برطانیہ کی طرف منتقل ہو جاتی مگر کوئی انتقال ملکیت وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ یہ علاقہ نظام کے مقبوضات میں اسی طرح شامل ہا جسطرح معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے تھا...... اگر ہز ہائی نس (جو اس وقت تک سن بلوغ کو نہ پہونچے تھے) امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ خواہش کرینگے کہ ان تمام معاملات پر جو دولتین کے درمیان از روئے معاہدہ

---

[۱] دیکھو لارڈ کیننگ کا مراسلہ نمبر ۴ صیغہ خارجیہ

ملے ہوئے ہیں ایک عام نظر ثانی کی جائے تو برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس
کی اس درخواست پر غور کرے گی۔"

یہ تمام سرکاری تحریرات اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ برار کی تفویض "دوامی" (Perpetual) نہیں تھی جیسا کہ لارڈ کرزن نے اسکو ۱۹۰۲ء میں ظاہر کیا بلکہ "عارضی" (Temporary) تھی جیسا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۷۸ء تک رزیڈنٹ سے لیکر وزیر ہند تک تمام ذمہ دار افسران متعلق اظہار و اعلان کرتے رہے تھے۔ یہ دستاویزات لارڈ کرزن کی اس تعبیر کو بھی بالکل غلط ثابت کرتی ہیں کہ "معاہدات میں حضور نظام کے لئے استرداد برار کا کوئی حق محفوظ نہیں رکھا گیا ہے۔" برعکس اس کے خود وہ وائسرائے جس نے ۱۸۶۰ء کا معاہدہ طے کیا تھا اپنے معاہدہ کی یہ تعبیر کرتا ہے کہ برار کی تفویض ایک امانت (Trust) کے طور پر تھی اور کنٹنجنٹ کی برطرفی کے بعد اسکو ایک لمحہ کیلئے بھی باقی نہیں رہنا تھا لارڈ کرزن نے معاہدات کی یہ تعبیر کی کہ ان کے ماتحت صرف دو ہی صورتوں پر عمل کیا جا سکتا تھا ایک یہ کہ برار کا دوامی پٹہ لکھدیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ تفویض کی موجودہ الوقت صورت کو دواماً جاری رکھا جاتا۔ اس کے سوا تیسری صورت کو اس نے ناممکن قرار دیا۔ حالانکہ کرنل لو اور لارڈ کیننگ جو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کے اصلی بانی تھے انہوں نے صراحت کیساتھ تیسری صورت یعنی برار کی واپسی کا نہ صرف امکان ظاہر کیا تھا بلکہ انکے نزدیک عارضی تفویض کو برار کی واپسی ہی پر ختم ہونا چاہیے تھا اس معاملہ میں لارڈ کرزن نے ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی بھی کھلی ہوئی معنوی تحریف کی جس کے اندر بالفاظ صریح یہ لکھا تھا کہ

برار کی تفویض "امانت" (Trust) کے طور پر ہے' اور لارڈ سالسبری کے صریح وعدہ کو بھی پس پشت ڈالدیا جس میں سرکار نظام کو یقین دلایا گیا تھا کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں جب سن بلوغ کو پہونچکر بذات خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیں گے تو انہیں برار کی واپسی کے مسئلہ کو از سر نو چھیڑنے کا حق ہوگا۔ ان تمام سرکاری شہادتوں کے خلاف لارڈ کرزن نے معاہدات کی غلط تعبیر کرکے اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کو صریح دھوکا دیا اور ایک غلط اور ناجائز اثر ڈالکر انہیں دوامی پٹہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔

(۴) تفویض برار کی اصلی علت یہ تھی کہ کنٹنجنٹ کی پرورش کے لئے برٹش گورنمنٹ کو بقول لارڈ کیننگ کے ایک مادی ضمانت (Material guarantee) اور بقول سالسبری کے ایک ارضی ضمانت (Territorial guarantee) کی ضرورت تھی' اول اول جب اس کا مطالبہ کیا گیا تھا تو یہی کہا گیا تھا کہ چونکہ کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ٹھیک وقت پر باقاعدگی کے ساتھ نہیں ملتیں اسلئے ہمارے ہاتھ میں ایک مستقل ذریعہ آمدنی (Permanent Source of Income) ایسا رہنا چاہئے جس سے ہم اس ذمہ داری کو ادا کرسکیں چنانچہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸٦۰ء کی دفعات نمبر ٦ میں اس تفویض کی اصلی غرض اسی کو بیان کیا گیا تھا اور دونوں معاہدات کی ترتیب کے وقت یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جب کنٹنجنٹ کی ضرورت باقی نہ رہے گی تو تفویض منسوخ ہوکر ملک اسکے اصلی مالک کو واپس کردیا جائیگا۔ کرنل لو نے ۱۸۵۳ء میں کہا تھا کہ:۔

"جب یہ ساری فوج توڑ دی جائے گی جس میں چند ہی سال کی تدمت

ہو گی تو نظام ان اضلاع کو لے سکتے ہیں۔

۱۸٦۰ء میں لارڈ کیننگ نے کہا تھا کہ :۔

"وہ (یعنی اضلاع برار) نظام کو اس وقت بہ تمامہا واپس کر دیئے جائیں گے جب دونوں حکومتوں کو یہ مناسب معلوم ہو گا کہ ان قراردادوں کو بدل دیں جن کے ماتحت کنٹیجنٹ رکھی گئی ہے۔"

ان سرکاری تصریحات کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جب کنٹیجنٹ کے برطرف کر دینے پر دونوں حکومتوں کے درمیان اتفاق ہو جاتا تو وہ ملک جو کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے لئے لیا گیا تھا واپس کر دیا جاتا، لیکن لارڈ کرزن نے معاہدات کے اسپرٹ اور الفاظ دونوں کے خلاف یہ کیا کہ جب دونوں سلطنتوں کے درمیان کنٹیجنٹ کے برطرف کرنے پر اتفاق ہو گیا تو کنٹیجنٹ کو تو توڑ دیا، مگر ملک کو جو کنٹیجنٹ کی خاطر "ضمانت" میں لیا گیا تھا واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لارڈ کرزن خود اپنے نوٹ میں لکھتا ہے کہ :۔

"حیدرآباد کنٹیجنٹ جیسی کہ وہ اس وقت معاہدات کے ماتحت قائم ہے ایک فضول خرچ اور ناقابل اطمینان شے ہے حیدرآباد کے علاقہ میں جو فوجیں مقیم ہیں وہ جدید ضروریات سے بالکل زائد ہیں، اور ان کا اس نام سے باقی رہنا ہزہائی نس کیلئے نفرت انگیز بھی ہے اور بے موقع بھی۔"

۹۰ برس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کنٹیجنٹ کو "فضول خرچ" "ناقابل اطمینان" "زائد از ضرورت"، "نفرت انگیز" اور "بے موقع" تسلیم کیا گیا اور اس کے توڑ دینے پر سرکار نظام اور سرکار انگریزی کے درمیان اتفاق رائے ہو گیا۔ اس اتفاق رائے

سے اضلاع برار کو بہ تمامہا واپس کر دینے کیلئے وہ شرط پوری ہو چکی تھی جو ۱۸۶۱ء میں لارڈ کیننگ نے مقرر کی تھی، مگر لارڈ کرزن نے عقل، منطق، معاہدات اور مواعید سب کے خلاف علت کو فوت کرنے کے بعد بھی معلول کو برقرار رکھا اور کنٹینجنٹ کو توڑ دینے کے باوجود ملک اپنے قبضہ میں رکھنے پر اصرار کیا حالانکہ اب سرکار نظام کی طرف سے انگریزی حکومت پر کوئی ایسی ذمہ داری باقی نہ تھی جس کو ادا کرنے کے لئے کل ممالک محروسہ کا تیسرا حصہ اس کو دینے کی ضرورت باقی رہتی۔

یہ امور ایسے ہیں کہ جن کی بناء پر ۱۹۰۲ء کا یہ معاہدہ قطعاً ناجائز قرار پاتا ہے اور اسکی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں رہتی کہ سلطنت برطانیہ کے وائسرائے نے اپنے وفادار دوست کو دھوکہ دیکر اور غلط باتیں باور کرا کے لاعلمی کی حالت میں ایسی دستاویز پر دستخط حاصل کرلئے جسپر خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ ہرگز دستخط نہ کرتا اگر اس کو معاہدات کے اصلی معانی سے باخبر ہونے دیا جاتا، لارڈ کرزن نے قصداً اعلیٰحضرت مرحوم سے تنہائی میں یہ معاملہ طے کیا مدار المہام یا کسی اور واقف کار و معاملہ فہم مشیر تک کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہ دی اور ان کو ناواقفیت میں بزور بہ اصرار غلط باتوں کا یقین دلا کر انکے آبائی ملک کا سب سے زیادہ زرخیز حصہ ہمیشہ کے لئے ان سے حاصل کرلیا۔

یہ سلوک تھا سلطنت برطانیہ کا اپنے اس دوست کے ساتھ جس نے چند سال پہلے جوش وفاداری میں ۶۰ لاکھ روپیہ اسکی اعانت کیلئے پیش کیا تھا ممکن ہو کہ وفاداری کی قدرشناسی کا یہی وہ طریقہ ہو جس پر برطانی قوم فخر کرتی ہے

اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر کا دور

۱۹۱۱ء میں اعلیٰحضرت میر محبوب علیخاں مرحوم کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ فرمانروائے حال اعلیٰحضرت میر عثمان علیخان بہادر مسند آرائے سلطنت ہوئے آپکے زمام امور ہاتھ میں لینے کے تین ہی سال بعد وہ جنگ عظیم برپا ہوئی کہ جس میں انگریزی حکومت کیلئے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہو گیا۔ اس نازک وقت میں مسلمانوں کیلئے سلطنت برطانیہ کا وفادار رہنا سب سے زیادہ مشکل تھا، کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت جس کے بادشاہ کو تمام مسلمان اپنا امام سمجھتے تھے برطانیہ کے خلاف برسرپیکار تھی اور وہ ممالک اعمال جنگ کی زد میں تھے جن کی تعظیم و تکریم ہر مسلمان کا جزو ایمان تھی لیکن اس موقع پر اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر نے سلطنت برطانیہ کے ساتھ وہ وفاداری برتی جو اس سلطنت کے تمام دوستوں کی وفاداری سے زیادہ قیمتی اور خود اعلیٰحضرت کے پیشروؤں کی وفاداریوں پر بھی فائق تھی۔

ایک طرف حضور ممدوح نے اپنے اس اخلاقی و روحانی اثر کو استعمال کیا جو انہیں تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر حاصل تھا، اور مسلمانوں کو پورے زور کے ساتھ تلقین کی کہ وہ سلطنت برطانیہ کے مواعید پر بھروسہ کر کے اسکی وفاداری پر ثابت قدم رہیں یہ اخلاقی امداد اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ خود انگریزی سلطنت کے ارباب حل و عقد کو اعتراف ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جن اثرات کے ماتحت جنگ میں سلطنت کی امداد کی ان میں سب سے زیادہ حصہ اعلیٰحضرت

نظام دکن کا تھا۔

دوسری طرف اعلیٰحضرت نے اپنی سلطنت کے تمام ذرائع دولت برطانیہ کیلئے وقف کردیئے اس سلسلہ میں انہوں نے جو خالص مالی امداد دی انکی کیفیت ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔

قرضہ جنگ میں	۱۴۶۰۰۰۰۰
تکمیل جنگ کے لئے بطور امداد	۱۸۲۰۹۶۰۰
بیسویں دکن ہارس اور امپیریل سروس ٹروپس کے مصارف بحساب ۳ لاکھ روپیہ ماہانہ	۱۲۴۰۰۰۰۰
جنگ کو اختتام تک پہنچانے کے لئے خاص عطیہ	۱۵۰۰۰۰۰
تحت البحر کشتیوں کی مدافعت کے لئے	۱۵۰۰۰۰۰
شاہ و ملکہ کے ازدواج کی ۲۵ سالہ یادگار کے موقع پر	۳۷۵۰۰۰
پرنس آف ویلز رلیف فنڈ	۱۰۰۰۰۰۰
امپیریل رلیف فنڈ	۱۰۰۰۰۰
متفرق اعانتیں	۱۳۴۶۰۰

اس کے علاوہ دوران جنگ میں سرکار عالی کے تمام کارخانے سامان حرب کی طیاری کے لئے وقف رہے اور چار سال کی مدت میں انہوں نے ۹ لاکھ روپیہ کا سامان سلطنت برطانیہ کیلئے مہیا کیا۔ اعلیٰحضرت نے اپنی عزیز رعایا کو ہزاروں کی تعداد میں بھرتی کرکے میدان جنگ میں جانیں قربان کرنے کیلئے بھیجا آغاز جنگ سے اختتام تک دولت آصفیہ کی باضابطہ فوج جنگ کی عملی خدمات انجام

دیتی رہی اور اس کا خرچ سرکار نظام نے اپنے خزانہ سے دیا۔ حکومت ہند کی شدید مالی مشکلات کے زمانہ میں ۵۰ لاکھ روپے کی چاندی کی اینٹیں مستعار دیکر اسکی مالی ساکھ کو بحال کیا اور اسی طرح کی بیش قیمت اور مخلصانہ اعانتوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب ایسی ہی دوستانہ اعانتوں کی بدولت یہ سخت وقت سلطنت برطانیہ سے ٹل گیا جس میں اس کا برباد ہوجانا کچھ مستبعد نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اعلیحضرت کو ان کے ان گراں قدر احسانات کا بدلہ کیا ملا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ جہاں تک بانی جمع خرچ کا تعلق ہے بہت دل کھولکر احسان شناسی و اعتراف جمیل کا ثبوت دیا گیا۔ اعلیحضرت کو "ہز اگزالٹڈ ہائی نس" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ انہیں "یار وفادار سلطنت برطانیہ" (Faithful Ally of the British Govt.,) کا لقب عطا کیا گیا۔ شہنشاہ معظم سے لیکر ولی عہد، وائسرائے اور رزیڈنٹ تک سب نے متعدد مرتبہ ان کو بیش بہا خدمات پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے لیکن جب عملی احسان شناسی کا وقت آیا تو سلطنت برطانیہ کا رویہ یک سر مو بھی اسکی روایات قدیمہ کے خلاف نہ نکلا۔

اعلیحضرت کا مطالبہ استرداد برار

جنگ عظیم کے کامیاب اختتام کے بعد ہی ہندوستان میں ستیاگرہ، خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوگئیں جنہوں نے کچھ عرصہ کیلئے عظیم الشان

برٹش انڈین امپائر کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا، ان نازک اور پیچیدہ سیاسی حالات میں اعلیٰ حضرت نے اپنے حقوق طلب کر کے سلطنت برطانیہ کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا اپنی خاندانی شرافت کے خلاف سمجھا اور صرف یہی نہیں کہ حق طلبی سے محترز رہے بلکہ ان وطنی و اسلامی تحریکات میں بھی سلطنت برطانیہ کو اخلاقی امداد دیتے رہے اور اپنی ریاست میں تحریک خلافت تک کو بند کرا دیا جسکی بدولت اعلیحضرت کے متعلق ان کی ملت میں شدید بدگمانیاں پھیل گئیں۔

آخر جب یہ ہنگامہ و اضطراب کا دور ختم ہوا اور برٹش گورنمنٹ تمام اندرونی و بیرونی مشکلات سے نجات پاکر نسبتاً پرسکون حالت میں ہو گئی۔ تو اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخاں بہادر نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے کھوئے ہوئے صوبہ کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ اس غرض کیلئے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حضور ممدوح نے لارڈ ریڈنگ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے برار کے متعلق اپنے دعاوی وضاحت کے ساتھ پیش فرمائے اور اس کے ساتھ ایک میمورنیڈم بھی منسلک کیا جو اعلیٰ حضرت کے دعاوی کے متعلق تمام دستاویزی شہادتوں پر مشتمل تھا۔ یہ خط جنوری ۱۹۲۴ء کے اواخر میں عام طور پر شایع ہو چکا ہے، اس لئے اسکو نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے، البتہ اختصار کے ساتھ اسکے اصولی نکات ذیل میں درج کر دیئے جاتے ہیں۔

(۱) ۱۷۶۶ء میں پہلی مرتبہ برٹش گورنمنٹ نے دولت آصفیہ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ بوقت ضرورت اس کی فوجی امداد کرے گی اور دولت آصفیہ نے اس امداد کے معاوضہ میں شمالی سرکار کا علاقہ برٹش گورنمنٹ کے سپرد کیا تھا۔

(۲) ۱۸۰۰ء میں اسی فوجی امداد کے لئے ایک مستقل فوج حیدرآباد میں رکھی

ئی امداد اس کے لئے ۰۰۱۷۱۴۲ روپیہ کا خرچ دولت آصفیہ کے ذمہ عائد کیا گیا

(۳) سنہ ۱۸۰۰ء میں اس امدادی فوج کی مصارف کے لئے دولت آصفیہ سے ایک دوسرا علاقہ لیا گیا جس کی آمدنی ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ تھی، اسوقت یہ عہد کیا گیا تھا کہ یہ امدادی فوج ان تمام قوتوں کے خلاف ہر وقت استعمال کی جا سکے گی۔ جو دولت آصفیہ کے امن و سکون میں اندر سے یا باہر سے خلل انداز ہونگی۔ نیز اس کو ایسی حالت میں بھی استعمال کیا جا سکے گا جبکہ سرکار نظام کی رعایا میں سے کوئی اس کی اطاعت سے انحراف کریگا۔ یا خراج ادا کرنے میں پہلوتہی کرے گا

(۴) اس معاہدہ کے بعد جب سرکار نظام کو اپنی باغی رعایا کی سرکوبی کیلئے فوجی امداد کی ضرورت ہوئی تو اس فوج کی خدمات دینے سے انکار کیا گیا جو ۶۳ لاکھ کا ملک لیکر اسی غرض کیلئے قائم کی گئی تھی۔ اور ایک دوسری فوج انہی خدمات کو انجام دینے کے لئے قائم کی گئی جس کے لئے مزید ۴ لاکھ روپیہ سالانہ کا خرچ نظام کے ذمہ عائد کیا گیا۔

(۵) اس جدید فوج کا قیام نہ کسی معاہدہ پر مبنی تھا نہ اس کیلئے سرکار نظام سے اجازت لیگئی اور نہ برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ جائز تھا کہ ان خدمات کا معاوضہ دوبارہ وصول کرتی جن کا معاوضہ وہ پہلے وصول کر چکی تھی مگر صرف یہی نہیں کہ یہ معاوضہ وصول کیا گیا بلکہ سرکار نظام سے فوج کا خرچ وصول کرنے کے باوجود اس کے تمام انتظامات کلیتہً انگریزی رزیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھے گئے۔

(۶) سنہ ۱۸۵۳ء میں اس فوج کے بقایا ۴۳ لاکھ روپیہ (کلدار) سرکار نظام کے ذمہ قرض کے طور پر نکالا گیا، حالانکہ ۴۱ سال تک برٹش گورنمنٹ سکندرآباد

جالنہ کی آبکاری کا محصول بلا کسی حق کے وصول کرتی رہی تھی اور ۲۰ سال تک اس نے امدادی فوج کو جس کا خرچ وہ پہلے وصول کر چکی تھی۔ مقررہ تعداد سے زائد از ۲۵ فیصدی کم تعداد میں رکھا تھا۔ اگر دونوں سلطنتوں کے مطالبات کا باضابطہ محاسبہ کیا جاتا تو برٹش گورنمنٹ کے ذمہ خود سرکار نظام کا الٹا قرض نکل آتا۔ لیکن برٹش گورنمنٹ نے باوجود پیہم مطالبہ کے حساب فہمی کرنے سے اعراض کیا اور اپنے ۴۳ لاکھ روپے کی کفالت اور آئندہ کے لئے اس ناجائز فوج کے مصارف کی نظامت میں سرکار نظام سے اس کے ملک کا ایک اور حصہ طلب کیا۔

(۷) نظام اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے راضی نہ تھے مگر کمپنی نے فوجی حملہ کی دھمکی دیکر اور یہ خوف دلا کر کہ ان کی جان اور انکی سلطنت کی بھی خیر نہیں ہے، انہیں اس پر راضی کیا۔ اور اس طرح اضلاع برار کو دوآبہ رائچور اور دھاراسیو کی تفویض عمل میں آئی۔

(۸) ۱۸۵۳ء کا معاہدہ اس صریح مفاہمت کے ساتھ ہوا تھا کہ اضلاع مفوضہ صرف اسوقت تک برٹش گورنمنٹ کے تصرف میں رہیں گے جب تک سرکار نظام کو کنٹنجنٹ کی ضرورت رہے گی۔ اور یہ کہ جب سرکار نظام اس فوج کو توڑنے کی خواہش کرینگی تو اسے توڑ دیا جائے گا اور ملک اس کے اصلی مالک کو واپس دیدیا جائے گا۔ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں اسکی دوبارہ توثیق کی گئی۔

(۹) ۱۸۷۲ء میں جب سرکار نظام کی جانب سے کنٹنجنٹ کو توڑنے کی خواہش ظاہر کی گئی تو اور اضلاع مفوضہ واپس مانگے گئے تو انکا جواب یہ دیا گیا کہ فرمانروائے وقت کی نابالغی کے زمانہ میں ایسے مسائل پر بحث کرنا خالی از دقت نہیں ہے۔

(۱۰) جب فرمانروائے وقت نے خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو وائسرائے کی زبان سے ان کو پورے زور کے ساتھ یہ یقین دلایا گیا کہ برار کی تفویض عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ اس کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا اب سرکار نظام کو کوئی حق باقی نہیں رہا اور اس امر کا قطعی فیصلہ ہوچکا ہے کہ برار کبھی واپس نہ دیا جائے گا۔ یہ غلط امور تمام پچھلے عہود و مواثیق کے بالکل خلاف باور کراکے ۱۹۰۲ء میں فرمانروائے وقت سے دوامی پٹہ حاصل کرلیا گیا، اگر ان کو یہ غلط باور نہ کرایا جاتا تو خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ کبھی اس پٹہ کو منظور نہ کرتے۔

(۱۱) اگر بالفرض فرمانروائے وقت نے ۱۹۰۲ء کے تصفیہ کو برضا و رغبت قبول کیا تھا۔ تب بھی اس کا جواز مشتبہ ہے کیونکہ ایسا تصفیہ کرنا ان کے آئینی اختیارات سے باہر تھا اور ان حالات میں وہ اپنے ممالک کے کسی حصہ کو جو انکے پاس انکی رعیت اور ان کے جانشینوں کے لئے امانت کے طور پر تھا۔ منتقل کردینے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے۔

(۱۲) جبکہ برٹش گورنمنٹ نے معاہدات کرتے وقت سرکار نظام کے لئے برار کے استرداد کا حق صاف طور پر تسلیم کرلیا تھا، اور برار کی تفویض کنٹنجنٹ کے بقاء پر موقوف رکھی گئی تھی تو استحقاق بر بنائے تصرف قدیم (Perscripsion کا قانوناً کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں جس معاملہ میں برطانیہ کی نیک نیتی کا سوال درپیش ہو اس میں تصرف قدیم کے استحقاق کو پیش کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہے جب ۱۸۸۱ء میں میسور کی ریاست بحال کی گئی تھی، تب بھی دیانت و انصاف کے مقابلہ میں تصرف قدیم کے استحقاق کو چھوڑ دیا گیا تھا۔

(۱۳) پٹہ پر کسی ملک کے دیئے جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ پٹہ دار کے املاک میں جذب ہوگیا، علیٰ ہذا القیاس ملک برار کے پٹہ پر دیئے جانے سے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی و دیوانی نظام میں جذب ہوجائے وہ اب بھی ریاست حیدرآباد کا ایک غیر منفک جزو ہے، مگر ۱۹۲۰ء سے اب تک جو سیاسی تغیرات ہوئے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف مالی حیثیت سے اہل برار کی دولت غیر براریوں کے تصرف میں آ رہی ہے بلکہ جدید اصلاحات نے سیاسی حیثیت سے بھی ان کو باہر والوں کے تابع کر دیا ہے مثال کے طور پر صوبۂ متوسط کی قانون ساز کونسل میں اپنی وہ کمی تعداد کی بناء پر ماتحت پوزیشن میں ہیں۔

ان وجوہ و دلائل کو پیش کرکے اعلیٰ حضرت نے اپنے صوبہ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اس خیال سے کہ کہیں برطانی راج کی برکات سے اہل برار کے محروم ہوجانے کا پرانا عذر پھر نہ پیش کیا جائے حضور ممدوح نے یہ بھی تصریح کردی کہ وہ اہل برار کو حکومت میں اس سے زیادہ اشتراک عمل کا موقع دینگے جو اب تک برطانی راج میں ان کو حاصل رہا ہے اور ایک گورنر کے ماتحت انکو ذمہ دار حکومت خود اختیاری دیکر داخلی نظم و نسق کے اعتبار سے بالکل آزاد کردینگے۔

اعلیٰ حضرت کے اس مدلل اور مدبرانہ خط پر دہلی اور لندن میں ڈیڑھ سال تک غور و خوض ہوتا رہا اور ۱۱ر مارچ ۱۹۲۵ء کو لارڈ ریڈنگ کی طرف سے اس کا جواب ایک طویل خط میں دیا گیا۔ اس خط کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بنیادی مسائل سے اعراض کرنے کی وہی پرانی پالیسی اختیار کی گئی تھی

جیسے لارڈ سالسبری نے سر سالار جنگ کے جواب میں اختیار کیا تھا، مسئلہ برار میں سب سے پہلا اور اصولی سوال یہ ہے کہ آیا کنٹینجنٹ قائم کرنا اور اس کے مصارف کا بار سرکار نظام پر ڈالا جائز تھا یا نہیں؟ اگر جائز نہ تھا تو وہ قرض جس کی بناء پر برار کی تفویض عمل میں لائی گئی، سرے سے بے بنیاد ہی ٹھہرتا ہے اور ساری عمارت پیوند خاک ہو جاتی ہے جس پر برٹش گورنمنٹ کا قبضہ برار قائم ہے اس اہم ترین بنیادی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سنہ ۱۸۰۰ء، ۱۸۵۳ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدات کے معنی اور حدود پر بحث کرنا ناگزیر ہے لیکن سالسبری کی طرح لارڈ ریڈنگ نے بھی اس نکتہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور اسے چھوڑ کر اس طرح گذر گئے کہ گویا یہ کوئی قابل اعتنا شے ہی نہیں ہے اسی طرح دوسرا اہم بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سنہ ۱۸۵۳ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی رو سے برار کی تفویض قطعی تھی یا عارضی؟ مطلق تھی یا مقید تھی؟ اگر عارضی اور مقید تھی تو یقیناً لارڈ کرزن نے اسکو قطعی اور مطلق قرار دیکر ان معاہدات کی غلط تعبیر کی اور اعلیٰحضرت میر محبوب علیخاں مرحوم کو دھوکہ دیا لارڈ ریڈنگ کے جواب میں پہلے نکتہ کی طرح یہ نکتہ بھی چھوٹتا رہا اور ان دونوں ابتدائی مراحل کو چھوڑ کر انہوں نے دفعتہً تیسرے اور آخری مرحلہ پر اپنا سارا وزن رکھدیا کیونکہ وہاں ان کو ذرا سی پاؤں رکھنے کی جگہ ملتی تھی۔ ان کے سارے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ لارڈ کرزن اور فرمانروائے حیدرآباد کے درمیان سنہ ۱۹۰۲ء میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ برار کی قسمت کا آخری فیصلہ تھا اس کے بعد اب اس صوبہ کی قسمت کا سوال دوبارہ نہیں چھیڑا جا سکتا اس کو جائز ثابت کرنے کیلئے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"نظام اچھی طرح اس مباحثہ کے لئے تیار تھے جو ان کے اور لارڈ کرزن کے درمیان ہوا تھا۔ وہ خود اپنی مرضی سے تنہا ملاقات کیلئے آئے تھے ان پر وقت بے وقت جواب دینے کیلئے کوئی زور ڈالا نہیں گیا تھا بلکہ انہوں نے خود ایسا کرنا پسند کیا حالانکہ لارڈ کرزن برابر یہ مشورہ دیتے رہے کہ وہ پورے غور و خوض کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں اس ملاقات کے بعد بھی ان کو ساڑھے تین مہینہ کا وقفہ مل گیا جو ان کی بے ضابطہ منظوری کی باضابطہ تصدیق سے پہلے گذرا تھا۔ انہوں نے یہ باضابطہ تصدیق ایسے الفاظ میں کی جو مجبوری کے خیال کو تقویت دینے کے بجائے اعلیٰ درجہ کی طمانیت کو ظاہر کرتے ہیں اس کے بعد ان کو پھر تین مہینہ سے زیادہ کی مہلت عہدنامہ پر دستخط ہونے سے پہلے مزید غور کے لئے مل گئی اور آخر میں خود انکی اپنی یادداشت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاملہ کی اصلی صورت کے متعلق کسی غلط فہمی میں نہ تھے۔"

اس سے لارڈ ریڈنگ نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ۱۹۰۲ء کا عہدنامہ کسی دھوکہ اور فریب کے اثر سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ خوب سوچ سمجھ کر فرمانروائے وقت نے اپنی مرضی سے کیا تھا لیکن اگر اسے مان بھی لیا جائے کہ اعلیحضرت میر محبوب علیخاں مرحوم کو سوچنے سمجھنے کا خوب موقع دیا گیا تھا اور وہ بحث کے لئے خوب تیار بھی تھے اور انہوں نے آخری جواب دینے میں خود ہی جلدی بھی کی تھی تب بھی نفس مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اصلی سوال یہ ہے کہ جب وائسرائے نے ان سے صاف طور پر یہ کہدیا تھا کہ سابق معاہدات کی رو سے انکو استرداد برار کا کوئی حق نہیں ہے۔ برار کی تفویض عارضی بلکہ دوامی ہے اور برٹش گورنمنٹ

یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ برار کو نہ اسوقت اور نہ آئندہ بھی واپس دیگی تو ایسی حالت میں اعلیٰحضرت کیلئے سوچنے اور سمجھنے کی گنجائش ہی کونسی باقی رکھی تھی لارڈ کرزن نے تو وائسرایانہ تحکم کے ساتھ استرداد کا دروازہ بند کرنیکے بعد ان کیلئے صرف دو راستے باقی چھوڑے تھے ایک یہ کہ ۲۵ لاکھ سالانہ کے عوض دوامی پٹہ لکھدیں دوسرے یہ کہ موجود الوقت صورت کو برقرار رکھیں جس میں ان کو برار کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی ملنے کی توقع نہ تھی وائسرائے نے کہا تھا کہ وہ انہی دونوں صورتوں میں سے ایک کو اختیار کر سکتے ہیں اور تیسری صورت یعنی استرداد برار کا تصور بھی نہیں کر سکتے ایسی حالت میں اگر ان کو سوچنے اور سمجھنے کی مہلت بھی دی گئی تو وہ بے معنی تھی لارڈ کرزن پر ہمارا اعتراض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اعلیٰحضرت کو سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی بلکہ اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے عارضی اور مقید تفویض کو دوامی اور مطلق قرار دیا۔ اگر ہمارا یہ اعتراض صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ ۱۹۰۲ء کا معاہدہ غلط شرکے ماتحت ہوا اور اگر یہ اعتراض مسلم نہیں ہے تو بتایا جائے کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے عہدناموں اور ان کے متعلق سرکاری اعلانات کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس معاملہ میں یہی ایک بنیادی سوال ہے اور اسی سے لارڈ ریڈنگ نے گریز کیا ہے

اس طرح لارڈ ریڈنگ نے اصول کو چھوڑ کر تمام تر غیر متعلق اور فروعی باتوں تک اپنے جواب کو محدود رکھا اور آخر میں لکھا کہ

"یور اکزالٹڈ ہز ہائی نس کا خط اس کے لواحق سمیت، میں نے یہ سمجھکر کہ یہی آپ کی خواہش تھی ہز میجسٹی کے سکرٹری آف اسٹیٹ کو بھیجدیا تھا چنانچہ وہ بھی ان تمام نتائج سے متفق ہیں جن تک حکومت ہند پہنچی ہے، لہذا یہ فیصلہ

جسے میں آپ تک پہنچانے کی عزت حاصل کر رہا ہوں ہز میجسٹی کی حکومت کا فیصلہ ہے۔"

اگر لارڈ ریڈنگ کا جواب صرف بحث کی حیثیت رکھتا تو چنداں قباحت نہ تھی مگر بدقسمتی سے انہوں نے ایک طرف دعاوی کی تردید میں ناکافی اور بودے دلائل پیش کئے اور بنیادی مسائل پر بحث کرنے سے انکار کیا، اور دوسری طرف اپنے اس جواب کو "فیصلہ" کے رنگ میں لکھا اور نہ صرف اسپرٹ سے بلکہ الفاظ سے بھی یہ ظاہر کیا کہ "یہ فیصلہ" قطعی ہے یہ غیر معقول پوزیشن کسی طرح قابل اطمینان نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں بہادر نے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ایک اور خط لکھا جس میں ان کے تمام دلائل کا جواب دیتے ہوئے اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی کہ ایسے مسائل میں جو دو حلیف طاقتوں کے درمیان متنازع فیہ ہوں، کسی فریق کو آخری فیصلہ کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟ اس کے متعلق حضور ممدوح نے لکھا:۔

"حکومت برطانیہ کے ساتھ میرے تعلقات، نظام اور اپنی مملکت کا فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس ہجومی و دفاعی اتحاد کے تابع ہیں جو میرے اسلاف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان باہمی احترام، دوستی اور اشتراک مصالح کی بنیاد پر ہوا تھا۔۔۔۔۔ باستثناء ان مسائل کے جو خارجی طاقتوں اور خارجی سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے نظام اپنی ریاست کے داخلی امور میں ویسے ہی مختار رہے ہیں جیسی برٹش گورنمنٹ برٹش انڈیا میں رہی ہے اس استثناء کے ساتھ جس کا ذکر میں نے کیا ہے فریقین نے ہمیشہ من لحکومتی

مسائل میں جو قدرتی طور پر وقتاً فوقتاً ہمسایوں کے درمیان اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں، کامل آزادی اور خودمختاری کے ساتھ عمل کیا ہے۔ اب مسئلہ برار اس استثناء میں نہیں آتا اور نہیں آسکتا کوئی خارجی طاقت یا ایسی اس تفصیں میں متعلق یا مخل نہیں ہے پس یہ قضیہ دو ایسی حکومتوں کے درمیان متنازع فیہ رہجاتا ہے جو ایک ہی درجہ کی ہیں اور جنہیں سے کوئی کسی کی تابع نہیں ہے میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس درجہ کے دو فریق ایک دوسرے کے دعاوی اور تجاویز کو رد کردینے کی آزادی ضرور رکھتے ہیں مگر برٹش گورنمنٹ کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں یہ پوچھنے سے احتراز نہیں کرسکتا کہ مسئلہ برار میں لفظ "فیصلہ" کا استعمال کہاں تک صحیح ہے۔ خارجی امور کو الگ کرکے میں برٹش گورنمنٹ کے ایک حلیف کی حیثیت سے اپنے لئے یہ حق محفوظ رکھنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ ہز مجسٹی کی حکومت کے اس انکار کو محض ایک "انکار" سمجھوں نہ کہ "فیصلہ"...... میرے مطالبہ استرداد برار کے جواب میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کا انکار محض اسکی رائے کا اظہار ہو تو سکتا ہے مگر وہ مجھ پر اور میرے خاندان پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرسکتا کہ اب اس قضیہ کو ختم شدہ اور اپنے دعوے کو ہمیشہ کے لئے خارج شدہ سمجھ لیا جائے اس قسم کی پابندیاں ایسے حلفاء پر کبھی حاوی نہیں ہوسکتیں جو اپنے عہدناموں کی شرائط کے ماتحت اسکی پوری آزادی رکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی تجاویز سے اتفاق کریں یا نہ کریں۔"

آگے چلکر اعلیٰحضرت نے لارڈ ریڈنگ کے ایک اور غلط طرز تعبیر پر اعتراض

فرمایا ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے قضیہ برار کو ایک ایسا قضیہ قرار دیا تھا جس کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق اعلیحضرت فرماتے ہیں۔

"اس لفظ (یعنی فیصلہ) کا استعمال ایک دوسری قانونی اصطلاح "امر فیصل شدہ" (Regudicate) کے ساتھ، مجھے پھر مجبور کرتا ہے کہ مسئلہ برار میں فریقین کی اعتباری حیثیت کے متعلق اپنے تصور پر مزید زور دوں ....

.... یور ایکسلنسی یقیناً جانتے ہونگے کہ میرے اسلاف یکے بعد دیگرے (برار کی دوامی تفویض کی) تجاویز کو ردکرتے رہے ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد ہز میجسٹی کی گورنمنٹ "امر فیصل شدہ" کا تصور کئے بغیر اپنی تجاویز کو پیش کرتی اور ان پر اصرار کرتی رہی ہے جسطرح اس وقت اس اصطلاح کا اطلاق درست نہیں تھا، اسی طرح اب بھی جبکہ میں اس مسئلہ کے از سر نو افتتاح اور اس کے واجبی اور مناسب تفحص کی درخواست کر رہا ہوں اس کا اطلاق درست نہیں ہے، حلیفوں اور دوستوں کے درمیان اس قسم کے معاملات میں "امر فیصل شدہ" کا عذر کر کے تفتیش اور تجدید تجاویز کا سدباب نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کیا جانا چاہئے۔ یہ قاعدہ تو مقننوں نے بالکل دوسرے ہی ظروف واحوال کے لئے وضع کیا تھا، جو ایسے فریقین اور ایسے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں جو نہ تو ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اور نظام سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں اور نہ زیر بحث مسئلہ سے کوئی مجانست"

اس کے بعد اعلیحضرت نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کا جج بنجانا، اور محض انکار کی صورت میں بلا دلیل آخری و قطعی فیصلہ

صادر کر دینا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"قطع نظر اس کے جو میں اوپر لفظ "فیصلہ" کے استعمال اور قضیہ برار پر قاعدہ "امر فیصل شدہ" کے اطلاق کے متعلق کہہ آیا ہوں، ایک بے ضابطگی بھی جس کو نوٹس میں لائے بغیر چھوڑ دینا ناممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کوئی نزاع دو ایسے حلیفوں کے درمیان پیدا ہو، جو ایک خاص امر تصفیہ طلب میں ایک دوسرے کی نسبت تابعیت کی پوزیشن نہ رکھتے ہوں، تو کیا آخری فیصلہ محض رد و انکار کی صورت میں صادر کرنے کا حق کسی ایک کے لئے محفوظ رہنا چاہئے؟ اس قسم کا ضابطہ عمل تو یہ معنی رکھتا ہے کہ فریقین میں سے ایک جج بھی بن جائے کسی امر متنازع فیہ میں اس طریقہ سے اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو سکتا، جج اور فریق مقدمہ کا ذات واحد میں اجتماع، ایک ایسا انتظام ہے جو بہت کچھ قابل طلب چھوڑ دیتا ہے[۱]۔ ایک نامور قانون دان اور انگلستان کے سابق چیف جسٹس ہونے کی حیثیت سے یور اکسلنسی مجھ سے زیادہ اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ ایسے اجتماع سے بتری کریں۔"

اس کے بعد اعلیحضرت نے لارڈ ریڈنگ کے تمام دلائل کا لفظ بلفظ جواب دیا تھا۔ اور آخر میں اپنی طرف سے تصفیہ کی یہ صورت پیش کی تھی کہ:۔

۱۔ میں نے اس فقرہ کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اصل انگریزی میں جو لطف ہے اسے اردو میں منتقل کرنا مشکل ہے۔ دیکھئے کس قدر خوب لکھا ہے:۔

Judge and Party in one is an arrangement that leaves much to be Desired.

"تصفیہ برار کے متعلق امور متنازع فیہ کو ایک کمیشن کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ
اسکی تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرے اور اس کا صدر ایک بلند پایہ اور اعلیٰ
قانونی تجربہ رکھنے والا برطانی جنٹلمین ہو جسے وزیر ہند نامزد کریں۔ اور صدر کے
علاوہ اس کے چھ ارکان ہوں ان چھ میں سے دو حکومت ہند کے نامزد کئے
ہوئے ہوں، دو میرے منتخب کئے ہوئے ہوں اور دو خود اہل برار کے نمائندے
ہوں جنہیں صوبہ متوسط کی کونسل، لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے
غیر سرکاری براری ارکان منتخب کریں، اس طرح منتخب کئے ہوئے کمیشن کے
لئے متعین مگر وسیع حدود بحث و تفتیش مقرر کئے جائیں تاکہ وہ ان تمام مسائل
کی مکمل تحقیقات کرے جنمیں بدقسمتی سے ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اور میرے درمیان
اختلاف رائے ہے ان حدود کی تعین اس طرح ہو سکتی ہے کہ حکومت ہند
کے شعبہ سیاسیات کا ایک افسر اور میرا ایک آدمی یہ دونوں ملکر بحث کرلیں
اور اس کے بعد میں اور یور اکسلنسی امور تنقیح طلب کو باتفاق رائے طے کرلیں
اس کمیشن کا پورا خرچ میری حکومت برداشت کرے گی۔

میں نے اس خط کے خاص خاص حصوں کو خود اعلیحضرت کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ تاکہ ہر شخص اس کو پڑھکر اس کی معقولیت کا خود اندازہ کرے اعلیحضرت نے حکومت ہند کی اختیار کی ہوئی غلط پوزیشن پر جو اعتراضات کئے تھے انہیں کوئی منصف مزاج اور معقول آدمی ناروا اور بیجا نہیں کہہ سکتا اور امور متنازع فیہ کے تصفیہ کی جو صورت حضور ممدوح نے پیش کی تھی وہ بھی نہ صرف معقول مناسب بلکہ اعلیحضرت کی بہ نسبت خود حکومت ہند کے حق میں زیادہ مفید تھی، لیکن اسکا

جو جواب حکومت ہند کے رئیس اعلیٰ نے دیا اس کے متعلق اس سے بہتر کوئی اظہار رائے نہیں ہو سکتا کہ اس کو خود اسی کے الفاظ میں نقل کر دیا جائے لارڈ ریڈنگ اپنے ۲۷ مارچ ۱۹۲۶ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

" میں یور اگزالٹڈ ہائی نس کی پیروی میں اس قضیہ کی تاریخی تفصیلات پر بحث کرنا نہیں چاہتا، جیسا کہ میں آپ کو اپنے پہلے خط میں اطلاع دے چکا ہوں آپ کے پیش کردہ امور کی پوری توجہ کے ساتھ تحقیق و تفتیش کی گئی ہے اور اب جو کچھ آپ فرماتے ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو میری گورنمنٹ اور وزیر ہند کے اخذ کردہ نتائج پر اثر انداز ہوئی ہو ....

" آپ نے بیان کیا ہے کہ حیدرآباد کے داخلی امور میں آپ فرمانروائے ریاست حیدرآباد ہونے کی حیثیت سے وہی درجہ رکھتے ہیں، جو برٹش گورنمنٹ کو جہاں تک برطانی ہند کے داخلی امور کا تعلق ہے، ہندوستان میں حاصل ہے" .... یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یور اگزالٹڈ ہائی نس اپنے اور دولت عالیہ (PARAMOUNT POWER) کے تعلقات کے متعلق ایک غلط تصور رکھتے ہیں، جسے دور کرنا ہز امپیریل مجسٹی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجھ پر لازم ہے کیونکہ اس وقت ایک ایسے مسئلہ میں میری خاموشی کو ممکن ہے کہ بعد میں اس دعوے کے تسلیم کر لینے کا ہم معنی قرار دیا جائے، جسے آپ نے پیش کیا ہے تاج برطانیہ کی سیادت ہندوستان میں سب سے برتر ہے اور اس بنا پر کوئی والئی ریاست برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ طریق پر گفت و شنید کرنے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب حق نہیں ہو سکتا تاج کی برتری صرف معاہدات اور تہنا مجات ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ ان سے

بے نیاز ہو کر بھی قائم ہے۔ خارجی دول اور ریاست سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اس کے خصوصی اختیارات سے قطع نظر، برٹش گورنمنٹ کا حق اور فرض ہے کہ بحزم و احتیاط ان تمام عہود و مواثیق کا احترام کرتے ہوئے جو ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ کئے گئے ہیں ہندوستان کے طول و عرض میں امن اور حسن انتظام کو برقرار رکھے اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ اتنے معروف ہیں، اور دوسرے والیان ریاست کی طرح یور اکزالٹڈ ہائی نس پر بھی ان کا اطلاق اتنا روشن ہے کہ ان کو بیان کرنا مشکل ہی سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اگر توضیح کی ضرورت ہو تو میں یور اگزالٹڈ ہائی نس کو یاد دلاؤنگا کہ ۱۸۶۲ء میں دوسرے والیان ریاست کی طرح فرمانروائے آصفیہ کو بھی ایک سند دیگئی تھی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ان کے خاندان اور انکی حکومت کے بقاء کی خواہشمند ہے، بشرطیکہ وہ تاج کے وفادار رہیں۔ اور یہ کہ مسند حیدرآباد پر کسی کی جانشینی اس وقت تک جائز نہ ہوگی جب تک ہزمیجسٹی شہنشاہ معظم اسکو منظور نہ کرلیں، نیز جانشینی کے مسئلہ میں اگر کوئی نزاع برپا ہو تو برٹش گورنمنٹ تنہا اس کا فیصلہ کرے گی۔"

دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں برٹش گورنمنٹ کا حق مداخلت ان نتائج کی ایک دوسری مثال ہے جو برطانی تاج کی برتری کو لازمی طور پر متضمن ہیں فی الواقع برٹش گورنمنٹ نے بارہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ شدید وجوہ کے بغیر اس حق کو استعمال کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی مگر وہ داخلی اور خارجی تحفظ جس سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں انجام کار

برٹش گورنمنٹ ہی کی محافظ قوت کے باعث انہیں حاصل ہے اور جہاں کہیں شاہی مفاد کا تعلق ہو یا کسی ریاست کے طرز عمل سے اس کے باشندوں کی عام فلاح و بہبود پر واقعی اور شدید مضرت رساں اثر پڑ رہا ہو تو حسب ضرورت اس کا تدارک کرنے کی ذمہ داری آخر میں بالاتر قوت ہی پر عائد ہونی چاہئے۔ اندرونی حاکمیت (SOVERIGENTY) کے وہ تمام مدارج جن سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں سب کے سب بالاتر قوت ہی کی جانب سے اس ذمہ داری کی مناسب انجام دہی کے ساتھ مقید ہیں۔ اس پالیسی کی دوسری مثالوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو مذکورہ بالا مثالوں سے کچھ کم آپ کی اس رائے کی تغلیط نہیں کرتیں کہ باستثنائے امور متعلق بہ دول و سیاسیات خارجیہ یور اگزالٹڈ ہائی نس کی حکومت اور برٹش گورنمنٹ ایک ہی درجہ مساوات پر قائم ہیں۔ مگر میں اس موضوع پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ یور اگزالٹڈ ہائی نس کو "یار وفادار سرکار" کا خطاب حاصل ہے اس کا یہ اثر نہیں ہے کہ تاج برطانیہ کی سیادت میں آپ کی گورنمنٹ کو دوسری ریاستوں سے کوئی جداگانہ حیثیت حاصل ہو۔"

آپ نے حیدرآباد اور دولت عالیہ کے تعلقات کے متعلق اپنے موجودہ نقطۂ نظر کی توضیح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ جن نتائج پر پہنچی ہے ان کو لفظ "فیصلہ" سے تعبیر کرنے میں میں نے غلطی کی ہے نیز یہ کہ قاعدہ "امر فیصل شدہ" کا اطلاق حیدرآباد اور حکومت ہند کے مابین نزاعی امور میں درست نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یور اگزالٹڈ ہائی نس کی اس

رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ آپ کے پیش کردہ امور کے متعلق وزیرِ ہند کے احکام ایک "فیصلہ" کی حد تک نہیں پہنچتے، یہ دولت عالیہ کا حق اور امتیازی حق ہے کہ وہ تمام ان نزاعات کا فیصلہ کرے جو دو ریاستوں کے درمیان یا خود اس کے اور کسی ریاست کے درمیان پیدا ہوں، اگرچہ خاص خاص حالات میں ایک عدالت ثالثی بھی مقرر کی جا سکتی ہے مگر اس عدالت کا کام بھی فقط اتنا ہی ہے کہ حکومت ہند کو آزادانہ مشورہ دے باقی رہا فیصلہ تو اس کا حق حکومت ہند ہی کو حاصل رہے گا۔

رہا اصطلاح "امر فیصل شدہ" کا استعمال تو یہ میں بھی جانتا ہوں کہ حکومت ہند کے لئے کسی عدالت دیوانی کی طرح اس کی ممانعت نہیں ہے کہ کسی ایسے مسئلہ کی سماعت کرے جو پہلے کسی فیصلہ کا موضوع بن چکا ہو مگر "امر فیصل شدہ" کا قانونی اصول مخصوص عملی ملحوظات کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ایک ایسے مسئلہ کو جس کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو بار بار انہیں فریقین کے درمیان زیر بحث لانا کسی طرح مرغوب نہیں ہے

اب میں آپ کی اس درخواست کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ قبضۂ برار کی تحقیقات اور اس پر رپورٹ کرنے کے لئے کمیشن مقرر کیا جائے، والا گہر اعلیٰحضرت خود بھی جانتے ہیں کہ اب سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے حکومت ہند نے ایسے مسائل میں عدالت ثالثی مقرر کرنے کے لئے ایک خاص قاعدہ مقرر کیا ہے جنہیں کوئی ریاست حکومت ہند کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہو لیکن اگر آپ اس تحریر کو ملاحظہ کریں گے جو اس جدید انتظام پر مشتمل ہے تو آپ

دیکھیں گے کہ اس میں کوئی ایسی دفعہ نہیں رکھی گئی ہے جسکی رو سے ایسے
مقدمات میں بھی عدالت ثالثی مقرر کی جاسکتی ہو جن میں خود ہز مجسٹی کی
گورنمنٹ نے فیصلہ صادر کیا ہو، میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ایسا مقدمہ جیسا کہ
یہ ہے جس میں ایک پرانی نزاع کا خاتمہ ایک سمجھوتہ کے ذریعہ کیا جاچکا ہے،
اور وہ سمجھوتہ بھی پورے غور وخوض کے بعد ایسی شرائط پر ہوا ہے جو ابہام
سے پاک ہیں ثالثی کی غرض سے پیش کرنے کے لئے موزوں ہوسکتا ہے۔"

میں نے چند غیر ضروری فقروں کو حذف کرکے یہ پورا خط لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے تاکہ ہر شخص خود اس کو پڑھکر رائے قائم کرسکے۔ اس میں لارڈ ریڈنگ نے بیرار کے اصلی مقدمہ کو اس کے تمام قانونی اور واقعاتی نکات سمیت نظر انداز کرکے صرف اس امر پر زور دیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ بالادست ہے، اور دولت آصفیہ زیردست، اس لئے اگر بالادست نے زیردست کا ملک جبر سے یا حیلہ سے یا کسی طرح چھین لیا تو اب زیردست کو یہ حق باقی نہیں رہا کہ اس سے کسی دلیل وحجت کا مطالبہ کرے یا اپنے دعوائے استحقاق کو پیش کرکے اسپر بحث کرے یا کسی عدالت ثالثی کے ذریعے انصاف کرانے کی کوشش کرے بالادست کو حق ہے کہ بلا دلیل اپنی تائید میں خود فیصلہ صادر کردے اور زیردست کا فرض ہے کہ خواہ وہ مطمئن ہو یا نہ ہو، ہر صورت اس فیصلہ کو سنکر دم بخود رہ جائے لارڈ ریڈنگ نے دولت آصفیہ کو ایک ماتحت حکومت ثابت کرنے کیلئے جو طریق استدلال اختیار کیا ہے اس پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اسکی کمزوری تو اسی سے ظاہر ہے کہ تمام معاہدات وعہد نامجات میں

ان کو صرف ایک ۱۸۶۲ء کی سند مل سکی ہے جسکو کھینچ تان کر مشکل یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ داخلی امور میں بھی۔ دولت آصفیہ سلطنت برطانیہ کی تابع ہے حالانکہ ۱۸۰۰ء کا معاہدہ جسپر دولتین کے موجودہ تعلقات قائم ہیں، اسکی صاف تردید کر رہا ہے۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ دولت آصفیہ خارجی امور کی طرح داخلی امور میں بھی سلطنت برطانیہ کی تابع ہے تب بھی یہ سوال جوں کا توں رہتا ہے کہ حقوق کے متعلق متنازع فیہ امور میں بالاتری و طاقتوری کی بنا پر "فیصلہ" صادر کرنا اور فیصلہ بھی اس طرح کہ بحث و استدلال کا دروازہ بند کر کے سادہ اور خالص رد و انکار کی شکل میں جواب دیدیا جائے کہانتک جائز معقول اور اطمینان بخش ہو سکتا ہے؟ اس چیز کو خواہ کتنے ہی پیچ در پیچ اور وکیلانہ انداز بیان میں پیش کیا جائے۔ مگر کوئی صاحب عقل آدمی اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا کہ حق اور انصاف کے معاملہ میں نہ بالادستی استحقاق کی دلیل ہو سکتی ہے اور نہ زیردستی عدم استحقاق کی، اور خصوصیت کے ساتھ ایسا مقدمہ جس میں مدعی کی شکایات اتنی قوی اتنی مدلل اور اتنی معقول ہوں کبھی اس طرح طے نہیں ہو سکتا کہ بحث تفتیش تحقیقات کچھ نہ ہو اور مدعی علیہ صرف یہ دو حرفی حکم صادر کر دے کہ مدعی کا دعوی خارج، اگر بفرض محال یہ درست ہے کہ دولت آصفیہ حکومت برطانیہ کے مقابلہ میں ایک تابعانہ حیثیت رکھتی ہے تب بھی اسکی تابعیت برطانی ہند کے رعایا سے زیادہ ادنی تو نہیں ہے پھر برطانی رعایا کو حکومت کے خلاف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق ہے، اور انگریزی عدالتوں میں

رات دن "تاج" (CROWN) کے خلاف دعوے ہوتے رہتے ہیں تو کیا سلطنت آصفیہ کا تاجدار برطانی رعایا کے معمولی افراد سے بھی گیا گذرا ہے کہ اس کو ایک آزاد اور غیر جانبدار کمیشن کے ذریعہ اپنی شکایات کے متعلق تحقیقات کرانے کا حق بھی نہیں مل سکتا؟ فصل خصومات اور تصفیہ نزاعات کا یہ تو کوئی بھی معقول طریقہ نہیں ہے کہ پہلے ملک پر عارضی قبضہ کیا جائے اس دلیل سے کہ اگر نہ دو گے تو پونا کی دو رجمنٹیں تم پر حملہ کر دیں گی۔ پھر اس عارضی قبضہ پر دوامی تسلط کا پٹہ حاصل کیا جائے اس حجت سے کہ ملک تو تمہیں بہرصورت واپس نہ ملے گا، البتہ اگر تم دوامی پٹہ نہ لکھو گے تو اب تک اس میں سے جو تھوڑا بہت تمہیں ملتا رہا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا، پھر جب اصل حقدار اس ناجائز طریق ملک گیری پر اعتراض کر کے اپنے جائز دعاوی پیش کرے تو اس کو یہ کہکر خاموش کر دیا جائے کہ ہماری قوت تم سے بالاتر ہے اور ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تمہارے ملک کو واپس نہ کریں گے اس لئے تم کو یہ فیصلہ بے چون و چرا تسلیم کرنا چاہئیے! یہ طریقہ برسر جنگ دشمنوں کیساتھ اختیار کیا جائے تو چنداں قابل تعجب نہیں۔ مگر دوستوں کے ساتھ اور دوست بھی وہ جو مصیبت کے وقت جان کی جگہ جان اور روپے کی جگہ روپیہ قربان کرنے میں دریغ نہ کرتے ہوں اسے استعمال کرنا حق و انصاف ہی کا نہیں بلکہ انسانیت و شرافت کا بھی خون کرنا ہے۔

سلطنت برطانیہ خود بھی اپنے اس جواب کی غیر معقولیت کو سمجھتی ہے اور اُسے معلوم ہے کہ اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں جیسے مضبوط اور بیدار مغز فرمانروا کو

ایسے جوابات سے خاموش کرنا مشکل ہے اس لئے اس نے ان کے دعوے کو رد کرنے کے ساتھ ہی انہیں خاموش کرنے کا بالواسطہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ اعلیٰحضرت کیلئے خود ان کے ملک میں داخلی مشکلات پیدا کرنی شروع کر دیں، وہی دولت آصفیہ جو اکتوبر ۱۹۲۳ء سے پہلے تک تمام نقائص سے مبرا تھی، اور جسے نومبر ۱۹۲۳ء میں خود لارڈ ریڈنگ نے یہ سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا کہ اس کا نظم و نسق نہایت عمدہ اور قابل اطمینان ہے استرداد برار کا مطالبہ کرتے ہی اس میں ہزاروں عیوب نکلنے شروع ہو گئے، اس کی رعایا سے اس کے جاگیرداروں سے اس کے امرا و اعیان سلطنت سے اسکی پائیگاہوں سے غرض اسکی رعیت کے تمام طبقوں سے برٹش گورنمنٹ کو گہری ہمدردی پیدا ہو گئی اس کے فرمانروا کے انتظامی معاملات ہی نہیں بلکہ ذاتی معاملات تک نکتہ چینی و حرف گیری کے قابل ہو گئے اور اس امر کی شدید ضرورت پیش آ گئی کہ دولت عالیہ اس کے داخلی امور کی اصلاح کے لئے مداخلت کرے، استرداد برار کا مطالبہ کرنے سے پہلے تک ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی وہاں نہ تھی اور اصلاح امور کے لئے مداخلت کرنا بھی برٹش گورنمنٹ کے فرائض سے خارج تھا لیکن یہ مطالبہ کچھ ایسا منحوس نکلا کہ اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں کی زبان سے اس کے نکلتے ہی دفعتہً ہزاروں خرابیوں اور سینکڑوں عیوب کا دروازہ کھل گیا اور بیچاری حکومت برطانیہ پر اس مطالبہ کو رد کرنے کے ساتھ ہی بیسیوں ایسے فرائض کا بار آن پڑا جن سے وہ پہلے بالکل سبکدوش تھی یہ ڈھنگ ہیں جن سے حق طلبیوں کا منہ بند کیا جاتا ہے اور بالا دست بنکر زیر دستوں سے اپنے فیصلے منوائے جاتے ہیں۔

ڈیڑھ صدی کے تعلقات پر ایک نظر

انگریزی حکومت کیساتھ فرمانروایان سلطنت آصفیہ کے ابتدائی تعلق سے لیکر جدید ترین عہد تک ڈیڑھ صدی سے زائد مدت میں دونوں سلطنتوں کے سیاسی تعلقات کا جو حال رہا ہے، اس کو خود انگریزی ذرائع اور زیادہ تر معتبر و مستند سرکاری ریکارڈ کے حوالہ سے ان صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے اس طویل تاریخی داستان کی تفصیلات کو نظرانداز کر کے اگر اس کا ایک اجمالی خلاصہ نکالا جائے تو وہ ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ

"دولت آصفیہ کی جانب سے ہمیشہ وفاداری اور احسان کا برتاؤ
کیا گیا اور دولت برطانیہ کی جانب سے اس کا جواب ہمیشہ
بیوفائی اور محسن کشی کی شکل میں دیا گیا"

۱۷۶۶ء سے لیکر ۱۹۲۶ء تک دونوں کے سیاسی تعلقات کی پوری تاریخ کو پڑھ جائیے آپ دیکھیں گے کہ سلطنت برطانیہ پر کوئی نازک وقت ایسا نہیں آیا ہے جسمیں دولت آصفیہ نے جان و مال سے اسکی مدد نہ کی ہو، مگر اس کے ساتھ ہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دولت آصفیہ کے احسانات کا بدلہ اس کو نقصان پہنچا کر نہ دیا گیا ہو۔ نواب میر نظام علیخاں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی اور اپنی مملکت کی پانچ شمالی سرکاریں اور کڑپہ اور بلاری کے علاقے ان کی نذر کئے۔ مگر اس کا بدلہ یہ ملا کہ ان کی فوج کے بہترین حصہ کو زبردستی منتشر کیا گیا اور مرہٹوں کے

ہاتھوں اُن کی سلطنت کو پامال ہوتے دیکھکر انگریزوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔اس کے بعد نواب سکندر جاہ نے پہلی اور دوسری جنگ مرہٹہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ ان کو خود انکی مملکت میں بے بس کر دیا اور ان کے ملازموں سے سازباز کرکے ان کی مملکت کے لئے ہلاکت و بربادی کے تمام سامان مہیا کر دیئے۔ نواب ناصر الدولہ نے خود اپنے بھائی مبارز الدولہ کو جب کہ ان پر وہابی سازش کا الزام لگایا گیا تھا، قید کیا، سنہ ۱۸۳۵ء، سنہ ۱۸۳۶ء اور سنہ ۱۸۳۹ء میں کرنول اور گومسود وغیرہ کے خلاف فوجی امداد دی اور انگریزی حکومت کے ناجائز مطالبات پر بے چوں وچرا لاکھوں روپیہ کنٹنجنٹ کے لئے دیا، مگر اس سلوک کے عوض فوجی دھمکی دے کر اُن سے ان کی پوری ریاست کا تہائی حصہ زبردستی حاصل کر لیا گیا، نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے غدر کے ہنگامہ میں انگریزوں کی ایسی اعانت کی جس پر خود وزیر ہند نے انکو وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کا حکم دیا تھا۔لیکن اس وفاداری کی یہ قدر کی گئی کہ استرداد برار کے لئے اُن کے جائز مطالبات کو پیہم ٹھکرایا گیا اور آخر میں سالار جنگ کو گرفتاری تک کی دھمکی دیکر زبردستی خاموش کیا گیا۔نواب میر محبوب علیخاں مرحوم نے مصر و افغانستان اور روس کے خلاف مالی اور فوجی امداد پیش کی اور تمام عمر انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے رہے مگر ان کو اس کا یہ انعام دیا گیا کہ جب شدید مالی مشکلات میں مبتلا تھے تو ان کو برار کے منافع سے محروم کرکے اور معاہدات و مواعید کے

خلاف استرداد برار سے مایوس کرکے ان سے برار کا دوامی پٹہ حاصل کیا گیا آخر میں اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر نے جنگ عظیم میں برطانی سلطنت کے تمام غیر برطانی دوستوں سے زیادہ اسکی مالی اور فوجی اعانت کی اور موت و زیست کی کشمکش میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ مگر جب وہ سخت وقت گذر گیا تو ان کے احسانات کا بدلہ یہ دیا گیا کہ برار کے مسئلہ میں ان مطالبات کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا اور اس حق طلبی کی پاداش میں ان کے لئے طرح طرح کی داخلی مشکلات پیدا کرنے کا سامان کیا جاتا رہا ہے۔

اس ایک طرفہ دوستی کی داستان پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو آج سے بہت عرصہ پہلے خود ایک انگلو انڈین اخبار ٹائمز آف انڈیا کر چکا ہے وہ لکھتا ہے کہ :۔

"نظام دکن کے ساتھ ہمارے تعلقات اس زمانہ سے جبکہ ہم نے ایک محافظ قوت کی حیثیت اختیار کی موجودہ اور زیادہ روشن زمانہ تک ایسے رہے ہیں کہ ان کی تاریخ ہر اس شخص کو جو ہماری قومی سیرت اور دیسی دماغ پر اس کے اثر کو خوب تر دیکھنے کا حریص ہو، رنج و افسوس کے ساتھ پڑھنی چاہئے۔ ہم نے ظاہر تو یہ کیا کہ نظام کے مقبوضات کو خارجی دست برد اور داخلی انتشار سے بچائیں گے ان کی سلامتی کے ضامن رہیں گے، اور ان کی حالت کو درست کریں گے۔ مگر ہم نے کیا یہ کہ انکی سلطنت کے صوبے پر صوبے ہضم کرتے چلے گئے۔ درحقیقت ہم نے نظام کو مجبور کرکے اسی ملک کے اقطاع ان سے جبراً حاصل کئے جسکی حفاظت کی ذمہ داری

لیکن ہم اس کا معاوضہ بھی وصول کر چکے تھے۔ حیدر آباد کے لئے ہماری حمایت بجائے اس کے کہ تحفظ کی ضامن ہوتی الٹی قطع و برید اور دست برد کا ذریعہ بن گئی۔ ایسی حالت میں اسکو حمایت سے موسوم کرنا اس لفظ کا بے محل استعمال ہے۔ ایک سلطنت کا دوسری سلطنت کو اپنی حفاظت میں لینا اور پھر اس حفاظت کے معاوضہ میں اس کے بڑے بڑے اقطاع کو یکے بعد دیگرے سلب کرتے رہنا تا آنکہ وہ "محفوظ" سلطنت گھٹتے گھٹتے اپنی سابقہ عظمت و وسعت کا محض ایک شائبہ رہجائے اور محافظ سلطنت اپنے مقبوضات میں اضافہ کرتی چلی جائے ایک ایسی حرکت ہے جس کو لفظ حمایت و حفاظت سے تعبیر کرنا انتہا درجہ کی لغویت ہے اگر یہ نتائج اس نوع کے سیاسی تعلق کے ساتھ ناگزیر ہیں تو ایسی حالت میں اس حمایت کو مفید سمجھنا تو درکنار ہم کہیں گے کہ وہ کھلم کھلا دشمنی سے کچھ کم ہولناک نہیں ہے۔ اگر ہم نظام کو علانیہ جنگ میں شکست دیتے اور فاتح کی حیثیت سے شرائط صلح پیش کرتے تو توسیع مملکت کے سلسلہ میں خواہ وہ کامل الحاق کی شکل میں ہوتی یا ارضِ مفتوح کے فوجی احتلال کی صورت میں ہم کو شاید اس سے زیادہ ملک ہاتھ نہ آتا جتنا ہم نے دوستی کے خوش آیند مظاہرہ اور پُر فریب حمایت و حفاظت کے پردہ میں حاصل کر لیا"[1]

یہ تبصرہ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے، جتنا کہ آج سے ۵۰ برس پہلے تھا

---

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲ر اکتوبر ۱۸۶۶ء

اس تاریخی داستان کو دہرانے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ جو کچھ زمانہ سابق میں ہوتا رہا ہے، وہی اب بھی ہوتا رہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ سابق میں جو غلطیاں کی گئی ہیں انہیں بیان کرکے ان کے نتائج سے آگاہ کیا جائے اور انکی تلافی کا مشورہ دیا جائے۔ تاریخ اس لئے نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے اگر کوئی قوم ڈیڑھ سو برس سے حماقتیں اور غلطیاں کر رہی ہو تو ان کے اعادہ کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ وہ اسی ڈگر پر اور زیادہ اصرار کے ساتھ چلتی رہے اگر درحقیقت یہ ثابت ہو جاۓ کہ اسکے وہ افعال غلط اور غیر معقول تھے تو ہر خردمند انسان کے نزدیک اس کا نتیجہ صرف یہی ہونا چاہئے کہ آئندہ کیلئے وہ ان سے اجتناب کرے، جہاں تک ممکن ہو کھلے دل سے ان کی تلافی کرے، اور عقل صحیح کی روشنی میں اپنے لئے ایک نئی اور زیادہ بہتر پالیسی اختیار کرے، اس طویل مضمون کی تحریر سے میرا مقصد بھی یہی ہے کہ سلطنت برطانیہ کے مدبرین کو یہ مشورہ دوں کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گذشتہ نامۂ اعمال پر ایمانداری کے ساتھ ایک نگاہ ڈال لیں اور خود اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ کیا دوستوں اور وفاداروں سے یہی سلوک کیا جانا چاہئے، کیا کوئی قوم اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کرکے یہ امید کرسکتی ہے کہ کسی نازک وقت میں کوئی اس کی مدد کرے گا؟ کیا اس طرز عمل سے کوئی قوم اپنے دوستوں کی تعداد میں اضافہ اور دشمنوں کی تعداد میں تخفیف کرسکتی ہے؟ اور کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے برتاؤ سے

کوئی قوم دوسری قوموں کی وفاداری، اخلاص، اور محبت کو خرید سکتی ہے؟ اگر اہلِ برطانیہ کی عقل کا اس حد تک دیوالہ نکل چکا ہے کہ ان سوالات کا جواب اثبات میں دے تو وہ شوق سے اسی ٹیڑھے راستے پر چلتے رہیں جس پر چلتے رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھنے کے لئے تیار رہیں جو ایسی حرکات کا قدرتی نتیجہ ہے، لیکن اگر برطانی قوم میں فی الواقع کچھ ایسے صحیح الفکر ارباب نظر موجود ہیں جو اپنی سلطنت کی غلط پالیسی کے نتائج سمجھ سکتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اس پالیسی پر نظرثانی کریں، اور اپنے دوستوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو انعام و اکرام نہ سہی حق و انصاف سے جوڑ کر، اس وفاداری کا اپنے آپ کو جائز مستحق بنائیں جو ان کے لئے بڑے بڑے نازک اوقات میں حد درجہ قیمتی ثابت ہوئی ہے۔

ھدیہ

مقابل کے صفحات ناظرین کو ہدیۃً پیش کرنے کیلئے چھپوائے جاچکے تھے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ازراہ عنایت انھیں ضمیمہ کتاب بنانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اب یہ معاہدہ جو تکمیل کتاب کے لئے ضروری ہے بطور ضمیمہ اصل کتاب کے ساتھ پیش ہے۔

ناشران

محمد اقبال سلیم گاہندری سید علی شبر حاشمی

بی۔یس۔سی (عثمانیہ)

مُعاہدہ برار

۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

گزارش

ہم نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی مشہور و معروف تالیف "دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے، یہ کتاب مولانا نے ۱۹۲۸ء میں تالیف فرمائی تھی۔ اور اسی وقت یہ شائع ہوئی تھی۔

چونکہ مصنف کی اجازت کے بغیر کتاب میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے مابین جو معاہدہ مسئلہ برار پر ۱۹۳۶ء میں ہوا ہے۔ اس کے بغیر کتاب کا مضمون دوسری اشاعت تک مکمل نہیں ہے۔ اس لئے ہم معاہدہ برار ۱۹۳۶ء کو الگ چھاپ کر ہدیہ ناظرین کرتے ہیں ۱۹۲۸ء کے بعد سے دونوں حکومتوں کے مابین کوئی قابل ذکر بات بجز زیر نظر معاہدہ کے طے نہیں پائی۔ اس لئے صرف معاہدہ کا نقل کر دینا کافی ہے۔

علی شبر حاتمی
بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

محمد اقبال سلیم گاہنڈی
جولائی ۱۹۴۱ء

جریدۂ غیر معمولی

بہ حکم عالیجناب مہاراجہ بہادر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنتہ بالقابہم
پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

اعلیٰحضرت مظفر الملک و الممالک فتح جنگ آصف جاہ سابع کے آستان سے شرف ورود لایا ہوا فرمان نصرت نشان مترشدہ ۲۷ ؍ شعبان المعظم ۱۳۵۵ ؁ اطلاع عام کے لئے شائع کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے ۔ فقط

حیدر نواز جنگ
صدر المہام متعلقہ امور دستوری

فرمان

میں نے اپنے فرمان مورخہ ۱۲ ؍ شعبان المعظم ۱۳۵۲ ؁ میں لارڈ ولنگڈن کی حیدرآباد سے روانگی سے قبل اُن انتظامات کے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کیا تھا جو سرکار عظمت مدار کے ساتھ گفت و شنید کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان میں نئے دستور قائم ہونے پر میرے ملک بلدہ کے آئندہ نظم و نسق کی نسبت عمل میں آئینگے ۔ اُسی فرمان میں میں نے یہ لکھا تھا کہ رعایا کو اُن تدابیر کے

تفصیلی اعلان کا تحت انتظار رہیگا جن کی رو سے میرے ملک برار کا نظم ونسق ملک معظم سے کے اس ملک کیساتھ جو بنام ممالک متوسط موسوم ہے۔ مثل ایک صوبہ واحد کے ہوگا جس کا نام "ممالک متوسط وبرار" رہے گا۔ اور برار پر میری سلطنت عملاً اسطرح مجیز ہوگی کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے گی ۔

نیز یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ اور میری گورنمنٹ دونوں کو امید ہے کہ ہندوستان کا دستوری نشوونما بزودی ممکنہ اعلان مذکور کی اجازت دیگا تاکہ الواب طے شدہ سے مجھے جو اطمینان حاصل ہوا اوس میں میری رعایا بھی شریک ہوسکے ۔

چونکہ گفت وشنید اب بحمد اللہ کامیابی کیساتھ اختتام کو پہونچ چکی ہے اور میں نے بتاریخ ۷ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ ہجری مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء تہہ نامہ برار پر جو ملک معظم کے ساتھ ہے دستخط بھی ثبت کردے ہیں ۔ اس لئے بفضلہ تعالیٰ اب وقت آگیا ہے جبکہ تہہ نامہ کی دفعات اور نیز وہ منسلکہ مکتوب جو منجانب ملک معظم بدستخط ہز ایکسلنسی والسرائے بہادر میرے نام وصول ہوا ہے عوام کی اطلاع کی غرض سے شائع کردیئے جائیں ۔

موجودہ تہہ نامہ اور اس کے منسلکہ مکتوب کے ذریعہ یہ قدیم تصفیہ طلب مسائل جس طرح طے پائے ہیں نیز معاہدہ ۱۹۰۲ء کی تنسیخ سے مجھے کمال درجہ اطمینان ہوا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس یادگار موقع پر میری عزیز رعایائے حیدرآباد وبرار میرے اطمینان ومسرت میں شریک ہوگی

میرا یہ فرمان معہ منسلکات جریدہ غیر معمولی کے ذریعہ بغرض اطلاع عام شائع کیا جائے

۲۷ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ

شرح دستخط مبارک

معاہدہ

جو آج بتاریخ ۲۲ ماہ اکتوبر سنہ عیسوی انیس سو چھتیس مابین

ہز مجسٹی ملک معظم شہنشاہ کشور ہند و لفٹنٹ جنرل ہز اگزالٹیڈ

ہائنس آصف جاہ مظفر الملک والممالک نظام الملک نظام الدولہ

نواب سر میر عثمان علیخان بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت

برطانیہ جی۔سی۔ایس۔آئی۔جی۔بی۔ای نظام حیدرآباد (دکن) تکمیل پایا۔

ہرگاہ اُن ممالک محروسہ میں جو ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام حیدرآباد

کے اقتدار اعلیٰ کے تحت میں چند علاقہ جات موسوم برار شامل ہیں۔

اور ہرگاہ بذریعہ معاہدہ ۵۔ نومبر سنہ ۱۹۰۲ء یہ قرار پایا تھا کہ ہز اگزالٹیڈ

ہائینس کے علاقہ جات موسوم بنام برار میں جس پر ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اقتدار

اعلیٰ کے متعلق اُس معاہدہ میں مکرر اقرار کیا گیا تھا، سرکار عظمت مدار

جس طریق سے مناسب تصور کرے انتظام نظم و نسق عمل میں لائے گی۔

اور ہرگاہ ایک ایسے وفاق ہند کے قیام سے متعلق تجاویز پر

جو مشتمل ہو اُن ریاست ہائے ہند پر جو وفاق مذکور میں شرکت پر رضامند

ہوں اور اُن صوبجات برطانوی ہند پر جو بطور صوبجات خود مختار قایم ہیں

نمائندگان حکومت ہز مجسٹی و پارلیمنٹ سلطنت متحدہ و برطانوی ہند والیان ریاست
بارے میں مباحث ہو چکے ہیں۔

اور ہرگاہ وفاق ہند کے لئے پارلیمنٹ ایک دستور منظور کیا ہے
اور وہ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء میں مدون کیا جا چکا ہے لیکن
اوس میں اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ قانون مذکور کے مختلف حصے مختلف
تواریخ سے نافذ کئے جا سکیں گے۔

اور ہرگاہ قانون مذکور کے کسی حکم کا ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے کسی علاقہ
پر اُن کی رضامندی و اتفاق کے بغیر اطلاق نہ ہو گا۔

اور ہرگاہ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء میں اس امر کا انتظام
کیا گیا ہے کہ مابین ہز مجسٹی اور ہز اگزالٹیڈ ہائینس ایک معاہدہ بدین غرض طے
پانے کی صورت میں صوبہ جات متوسط اور برار کا نظم و نسق، جب تک کہ
ایسا معاہدہ نافذ العمل رہے۔ تحت قانون مذکور بطور ایک گورنر کے صوبہ
کے مشترکہ طور پر عمل میں آئے گا۔

اور ہرگاہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس اس امر کے خواہشمند ہیں کہ اُن
کے علاقہ جات موسوم بنام برار کا نظم و نسق بمعیت اُن علاقہ جات
ہز مجسٹی موسوم بہ صوبہ جات متوسط کے حسب احکام قانون مذکور عمل
میں آئے اور وہ بہ معیت علاقہ جات مذکور اُس وفاق کی جو تحت قانون
مذکور قائم ہونے والا ہے ایک وحدت قرار دی جائے اور بدین
غرض یہ قرین مصلحت سمجھا گیا ہے کہ بعوض معاہدہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء

ایک نئے معاہدہ کی تکمیل ہو۔

لہٰذا اب اس تحریر کے ذریعہ سے حسب ذیل قرار کیجاتی ہے

فقرہ اول ۔ ہز مجسٹی بمبار ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم اور اوس کا مکرر اقرار فرماتے ہیں ۔

فقرہ دوم ۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس اپنی اور اپنے ورثاء اور جانشینوں کی جانب سے بذریعہ ہذا اس امر کا اظہار فرماتے ہیں کہ بمتابعت ومطابقت شرائط مندرجہ معاہدہ ہذا وہ اپنے اُن علاقہ جات کے متعلق جو بنام برار موسوم اور آئندہ تحریر ہذا میں اُسی نام سے مذکور ہیں وفاق ہند میں جو تحت قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء تجویز کیا گیا ہے شرکت پر رضامند ہیں اور ہز مجسٹی بذریعہ ہذا اُس رضامندی کی نسبت اپنی قبولیت کا اظہار فرماتے ہیں ۔

فقرہ سوم ۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس اپنی اور اپنے ورثاء اور جانشینوں کی جانب سے بذریعہ ہذا قانون مذکور کے اُن احکام کے متعلق جن کا برار پر اطلاق ہو اس غرض سے اظہار قبولیت فرماتے ہیں کہ بمتابعت ومطابقت شرائط معاہدہ ہذا اور باوجود اس کے برار پر ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا اقتدار اعلیٰ برقرار رہے گا برار اور ہز مجسٹی کے وہ علاقہ جات جو صوبہ جات متوسط کے نام سے موسوم ہیں دونوں کا نظم ونسق اس طرح عمل میں آئے کہ گویا وہ ایک ہی صوبہ ہیں جو بنام صوبہ جات متوسط وبرار موسوم ہوگا۔ اور یہ ہز مجسٹی اور جملہ وفاقی مرکزی وصوبجاتی ادارہ ہائے حکومت

صوبہ جات متوسط و برار کی نسبت وہ تمام اختیارات وفرائض انجام دین جن کے وہ قانون مذکور کی روسے یا اوس کے تحت حامل ہیں۔

فقرہ چہارم۔ صوبہ جات متوسط وبرار کے گورنر کا تقرر منجانب ہز مجسٹی بعد مشورہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس عمل میں آئیگا۔ اور گورنر جو اختیارات وفرائض تحت قانون مذکورہ منجانب یا بہ نیابت ہز مجسٹی انجام دے سکینگے وہ برار کی حد تک ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس معاہدہ کو منظور فرمانے کی بنا پر انجام دیئے جائینگے۔

فقرہ پنجم۔ برار میں جب کبھی اور جہان کہیں گورنر صوبہ جات متوسط و برار کے احکام کی بنا پر برطانوی پرچم بلند کیا جائیگا۔ تو اس کے پہلو بہ پہلو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا پرچم بھی بلند کیا جائیگا۔

فقرہ ششم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا یہ حق بذریعہ ہذا تسلیم کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد کے اعزازی خطابات باشندگان برار کو عطا فرمائیں بشرطیکہ ہز مجسٹی کے اُس قائم مقام کا اتفاق قبل از قبل حاصل کیا جائے جو ریاستہائے ہند سے تاج برطانیہ کے تعلقات کے ضمن میں تاج کے اختیارات وفرائض انجام دینے کا مجاز ہو۔

فقرہ ہفتم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس حق کو ہز مجسٹی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ برار میں دربار منعقد فرمائیں بشرطیکہ ہر مرتبہ ہز مجسٹی کے قائم مقام مذکور کا اتفاق حاصل کیا جائے۔

فقرہ ہشتم ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو اختیار رہوگا کہ ہز مجسٹی کے قائمقام

مذکور کے اتفاق سے گورنر صوبجات و برار کو موزون تقاریب میں رسمی شرکت کے لئے حیدرآباد آنے کی دعوت دیں۔

فقرہ نہم - برار کی مسجد میں ہزاگزالٹیڈ ہائنس کے نام سے خطبہ پڑھے جانے پر ہز مجسٹی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

دفعہ دہم - باوجود اختتام معاہدہ مذکورہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء ہز مجسٹی سالانہ رقم پچیس لاکھ روپیہ جو برار کی بابت اس وقت تک ادا ہوتی رہی ہے ہزاگزالٹیڈ ہائنس کو ادا فرماتے رہیں گے۔

فقرہ یازدہم - ہزاگزالٹیڈ ہائنس کو یہ حق ہوگا کہ صوبہ جات متوسط و برار کے مستقر حکومت میں اپنا ایک ایجنٹ بدین اغراض قائم رکھیں کہ وہ کسی ایسے معاملہ سے متعلق اپنی حکومت کے خیالات کی نمایندگی کرے جو صوبہ جات متوسط و برار اور حیدرآباد دونوں کے مشترکہ اغراض پر مشتمل ہو یا جو حیدرآباد کے اغراض پر بلا واسطہ موثر ہو۔ لیکن بجز صورت مصرحہ بالا ایجنٹ مذکور کو صوبہ جات متوسط و برار کے کسی داخلی معاملہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

فقرہ دوازدہم - گورنر صوبہ جات متوسط و برار نظم و نسق برار میں اپنی اس خاص ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے جو کسی ریاست ہند کے حقوق کی حفاظت سے متعلق ہو ریاست حیدرآباد کے تجارتی و معاشی اغراض کا لحاظ واجب رکھیں گے۔

فقرہ سیزدہم - گورنر جنرل کو لازم ہوگا کہ مجلس وضع قوانین صوبجات

متوسط و برار کے کسی ایسے مسودہ قانون کی نسبت جس کا اطلاق برار پر ہوتا ہو اور جو ادن کے غور کے لئے مختص کیا گیا ہو ہز مجسٹی کے نام سے اپنی منظوری کا اعلان کرتے ہوئے اس امر کی صراحت کریں کہ جہاں تک اس کا اطلاق برار پر ہوگا مسودہ قانون کو جو منظور کیا گیا وہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس معاہدہ کو منظور فرمانے کی بنا پر ہے۔

فقرہ چہاردہم - گورنر صوبہ جات متوسط و برار کو لازم ہوگا کہ مجلس وضع قوانین صوبہ جات متوسط و برار کے کسی ایسے مسودہ قانون کی نسبت جس کا اطلاق برار پر ہوتا ہو ہز مجسٹی کے نام سے اپنی منظوری کا اعلان کرتے ہوئے یا اس قسم کے کسی ایسے مسودہ قانون کی نسبت جو ہز مجسٹی کے اظہار پسندیدگی کے لئے محفوظ کیا گیا ہو ہز مجسٹی کی منظور کرتے ہوئے اس امر کی صراحت کریں کہ جہاں تک ادس کا اطلاق برار پر ہوگا مسودۂ قانون کو جو منظور کیا وہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس معاہدہ کو منظور فرمانے کی بناء پر ہے۔

فقرہ پانزدہم - معاہدہ ہذا میں کوئی امر کسی طرح ادن فوجی کفالتوں پر موثر نہیں ہے اور نہ ادن میں تخفیف کرتا ہے جن سے ہز اگزالٹیڈ ہائینس کسی موجودہ تہ نامہ یا معاہدہ کے تحت مستفید ہو رہے ہیں اور معاہدہ ہذا میں کسی امر کی ایسی تعبیر نہ کی جائیگی جس سے فوجی جمعیت موسومہ بنام حیدرآباد کنٹنجنٹ کو یا ادس کے جدید قائم مقام جمعیت کو کو برقرار رکھنے کے لئے ہز اگزالٹیڈ ہائینس پر آئندہ کوئی ایسی ذمہ داری

جو بتاریخ معاہدہ ہذا موجود عائد کی جائے۔

فقرہ شانزدہم مجلس وضع قوانین صوبہ جات متوسط و برار کے انتخابات کے متعلق اور بعد قیام وفاق انتخابات کونسل آف اسٹیٹ کے متعلق احکام مندرجۂ ذیل کے بموجب عمل ہوگا۔

الف۔ جس حد تک کہ رائے دہندوں کی قابلیت کسی امتحان کی کامیابی پر منحصر ہو۔ حیدرآباد کے کسی مساوی درجہ کے امتحان کی کامیابی کا برار کے حلقہ ہائے انتخاب کی نسبت وہی اثر ہوگا جو کسی ایسے امتحان کی کامیابی کا ہوتا ہے جو عموماً صوبہ جات متوسط و برار میں فی الوقت رائے دہندوں کو رائے دہی کے قابل بناتی ہو۔

ب۔ جس حد تک کہ رائے دہندہ کی قابلیت کسی فوج باقاعدہ یا کسی جمعیت پولس میں اوس کی یا کسی اور شخص کی شرکت پر منحصر ہو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے افواج باقاعدہ کی اور جمعیت پولیس ریاست حیدرآباد کی رکنیت برار کے حلقہ ہائے انتخاب کی نسبت ایسی ہی تصور کیجائے گی جیسی کہ علی الترتیب ہز مجسٹی کے افواج باقاعدہ کی اور کسی جمعیت پولس برطانوی ہند کی رکنیت تصور کیجاتی ہو۔

فقرہ ہفتدہم۔ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء کے حوالہ جات مندرجہ معاہدہ ہذا کی یہ تعبیر کی جائے گی کہ اُن حوالہ جات کا اطلاق قانون مذکور پر بشمول ایسی جملہ ترمیمات کے ہوگا جو مابعد کے کسی قانون کی رو سے یا اوس کے تحت ہوئی ہوں۔ لیکن اگر کوئی ایسی ترمیم عمل میں آئے

جواس معاہدہ کی کسی شرط کے متناقص ہو یا جس سے یا جس سے قانون مذکور کے کسی حکم مصرحہ ضمیمہ معاہدہ ہذا کی ترمیم ہوتی ہو اور یہ ترمیم ایسی نہ ہو جس کا برار پر اطلاق ہوتا ہز اگزالٹیڈ ہائنس نے منظور فرمایا ہو یا جس کا اطلاق صرف علاقہ جات ماسوائے برار پر ہوتا ہو تو ہز اگزالٹیڈ ہائنس ...... کو اختیار ہوگا کہ تاریخ ترمیم مذکور سے چھ ماہ کے اندر کسی وقت اس بارے میں اطلاع دیکر معاہدہ ہذا کو ختم فرمادیں۔

فقرہ ہیجدہم معاہدہ ہذا کو بعوض معاہدہ مورخہ ۵ رنومبر ۱۹۰۲ء نافذ العمل رہیگا۔ اور اس میں بجز رضامندی فریقین کوئی تغیر یا ترمیم نہو سکے گی۔ اور بمتابعت شرائط مندرجہ آخر فقرہ ماسبق کسی ایک فریق کی جانب سے اُس وقت ختم نہ کیا جاسکیگا جب تک کہ اُس کے محفوظ حقوق فریق ثانی کو پابندی کے ساتھ محفوظ رہیں اور وہ اُس تاریخ سے نافذ ہوگا جو حصہ سوم قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے لئے مقرر کیگئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ مذکور کے قبل قانون مذکور صوبہ جات متوسط و برار میں نافذ کرنے کی غرض سے برار میں ایسے تدابیر اختیار کئے جاسکیں گے جن کا قانون مذکور کی رو سے یا اوس کے تحت کسی آرڈر ان کونسل رو سے اختیار دیا جائے۔

فقرہ نوازدہم قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کی دفعہ (۶) کے احکام کا معاہدہ ہذا پر اطلاق نہ ہوگا اور نہ وفاقی عدالت کا اختیار سماعت کسی ایسی نزاع پر حادی ہوگا جو اُس کے تحت پیدا ہو۔

فقرہ ہفتم۔ معاہدہ ہذا کا کوئی امر ہز اگزالٹیڈ ہائنس کے ان حقوق پر جو ان کے علاقہ جات ماسوائے برار سے متعلق ہوں موثر نہ ہوگا اور بذریعہ ہذا اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء کے حصہ دوم کے احکام کی روسے جس وفاق ہند کی تجویز ہوئی ہے اس میں شرکت کے متعلق خواہ ہز اگزالٹیڈ ہائنس دستاویز کی تکمیل فرمائیں یا نہ فرمائیں۔ اور خواہ ہز مجسٹی ایسی دستاویز قبول فرمائیں نہ فرمائیں بہر حال اقرارنامہ ہذا نافذ العمل رہے گا۔

بہ توثیق امور مصرحہ صدر معاہدہ ہذا پر ہز ایکسلنسی دی موسٹ آنریبل دی مارکوئیس آف لن لتھگو۔ پی۔ سی۔ کے۔ ٹی۔ جی۔ ایم۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ ایم۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔ ڈی۔ ایل۔ ٹی۔ ڈی۔ نے جو ہز مجسٹی کے وائسرائے اور گورنر جنرل کشور ہند ہیں۔ منجانب ہز مجسٹی اپنے دستخط ثبت فرمائے ہیں اور لفٹننٹ جنرل ہز اگزالٹیڈ ہائنس آصف جاہ مظفر الملک و الممالک نظام الملک نظام الدولہ نواب میر عثمان علیخاں بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت برطانیہ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ بی۔ ای۔ نظام حیدرآباد (دکن) اپنے دستخط ثبت فرمائے ہیں

ضمیمہ

(ضمیمہ ہٰذا میں جہاں صوبہ اور گورنر کا ذکر آئے اُس سے صوبہ جات متوسط و برار اور وہاں کا گورنر مراد ہے)

قانون کے حصص اول کا اس قدر جزو جو ہز مجسٹی سے اور گورنر جنرل سے اور ہز مجسٹی کے اُس قائم مقام سے متعلق ہو جو ریاستہائے ہند سے تاج برطانیہ کے تعلقات کے ضمن میں تاج کے فرائض و اختیارات کے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔

حصہ جات دوم و سوم کے محولہ ذیل احکام۔

دفعہ ۷ ضمن (۱) و ضمن (۲)

دفعہ ۹ ضمن (۳)

دفعہ ۱۲۔ ضمن (۲)

دفعہ ۱۴۔ ضمن (۱)

دفعات ۳۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۹۔

دفعہ ۵۰۔ ضمن (۳)

دفعہ ۵۲۔ ضمن (۳)

دفعات ۵۴ - ۵۵ - ۷۵ - ۷۶ - ۷۷ - ۸۹ - ۹۰ -

(جو عام احکام امور ذیل کے متعلق ہیں یعنے صوبہ میں وفاق کے انتظامی اختیار کا استعمال، کارروائی منجانب گورنر جنرل یا گورنر بہ لحاظ اُن کے صوابدید کے یا باستعمال اُن کی انفرادی قوت فیصلہ کے، وزیر ہند کا گورنر جنرل پر اور گورنر جنرل کا گورنر پر اختیار نگرانی آرڈر ننسز جو گورنر جنرل یا گورنر اپنے صوابدید سے نافذ کرے اور گورنر جنرل و گورنر کے نافذ کردہ قوانین

دفعہ ۱۱ ضمن (۱) جس حد تک کہ اُس میں یہ محکوم ہے کہ گورنر جنرل مدافعت کے معاملات میں اپنے حسب صوابدید عمل کریں۔

دفعات ۱۲ و ۲۵ جس حد تک کہ اُن کی رو سے دفعہ (۱۲) ضمن (۱) کے فقرات (اے) و (جی) کی متذکرہ خاص ذمہ داریاں گورنر جنرل پر اور دفعہ ۵۲ ضمن (۱) کے فقرات (اے) (اف) اور (جی) کی متذکرہ خاص ذمہ داریان نیز وہ خاص ذمہ داری متعلقہ بر ازمتذکرہ ضمن (۲) (۲) دفعہ مذکور جو گورنر پر عاید ہوتی ہے۔

دفعہ (۳۸) ضمن (۱) اور دفعہ ۴۸ ضمن (۱) کی متعلقہ شرط کا اس قدر حصہ جس میں گورنر جنرل یا گورنر کے لئے یہ حکم ہے کہ اپنے صوابدید کے لحاظ سے امور ذیل کے متعلق قواعد وضع کرے۔

(الف) متذکرہ بالا خاص ذمہ داریوں کی ادائی سے متعلق وفاقی یا صوبہ جاتی مجلس وضع قوانین کے ضابطہ کارروائی اور طریق کار کو منضبط کرنا

(ب) اُن امور پر جو ریاست ہائے ہند سے یا کسی والی ریاست یا ریاست

کے حکمران خاندان کے کسی فرد کی ذاتی روش سے متعلق ہوں بحث کرنے یا سوالات پیش کرنے کی تا بجد محکومہ شرط مذکورہ ممانعت۔

اور دفعہ (۳۸) کے مذکورہ ضمن (۱) کی شرط کا اس قدر حصہ جس میں گورنر جنرل کیلئے یہ حکم ہے کہ آن کے حسب صوابدید اس غرض سے قواعد وضع کریں کہ مداخلت سے متعلق وفاقی مجلس وضع قوانین کے ضابطہ کارروائی اور طریق کار کو منضبط کریں اور صوبہ کے معاملات سے متعلق کسی کارروائی پر جو وہ اپنے حسب صوابدید عمل میں لائیں بحث کرنے یا سوالات پیش کرنے کی تا بجد محکومہ شرط مذکور ممانعت کی جائے۔

دفعہ ۴ ضمن (۲) اور دفعہ ۸۶ ضمن (۲) جن کے تحت گورنر جنرل یا گورنر مجاز ہیں کہ وفاقی یا صوبجاتی مجلس وضع قوانین میں ایسے مباحث پر قیود عاید کریں جو دفعہ ۱۲ ضمن (۱) کے فقرہ (اے) اور دفعہ ۵۲ ضمن (۱) کے فقرہ (اے) کی متذکرہ خاص ذمہ داریوں کی ادائی پر موثر ہوتے ہوں

دفعہ ۴۷ (جو برار سے متعلق ہے)

دفعہ (۱۰۸) جس حد تک کہ اس کی رو سے محکوم ہے کہ ایسے مسودات قوانین یا ترمیمات کی پیشی یا آن کے متعلق تحریک کے لئے اولاً گورنر جنرل کی منظوری آن کے حسب صوابدید یا گورنر کی منظوری اُن کے حسب صوابدید حاصل کی جائے۔ جنسے گورنر جنرل یا گورنر کے قوانین یا آرڈیننس کی جو انھوں نے اپنے حسب صوابدید مشتہر کرائے ہوں تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو یا جو قوانین یا آرڈیننس مذکور کے مخالف ہوں یا بجد ممانعت

سے متعلق امور پر موثر ہوں۔

دفعہ (۱۱۰) باستثناء اُن صورتون کے جن میں وہ ایسے قوانین کے وضع کرنے سے متعلق ہوتی ہون جو لا آف برٹش نشلیٹی آرمی ایکٹ، آیر فورس ایکٹ، نیول ڈسپلین ایکٹ، لا آف پرائنر آر پرائیز کورٹس پر یا مرافعات مرجوعہ پریوی کونسل باجازت خاص پر موثر ہوں۔

باب اول حصہ نہم جو وفاقی عدالت سے متعلق ہے باستثناء دفعہ (۲۰۶) باب مذکور۔

دفعات ۲۴۴ و ۲۷۶۔ دفعہ ۲۲۰ ضمن (۴)۔ دفعہ ۳۱۱ ضمن (۷) اور ضمیمہ چہارم جس حد تک کہ وہ آن حلفون اور اقرارات صالح سے متعلق ہیں جو ایسے اشخاص کو اٹھانے یا کرنے ہون جو برطانوی رعایا نہوں۔

شرح دستخط

میر عثمان علیخان

میرے مواجہہ میں

شرح دستخط ڈی۔ جی۔ میکنزی

ریزیڈنٹ متعینہ حیدرآباد

۲۴ اکٹوبر سنہ ۱۹۳۶ء

شرح دستخط

بخدمت

لفٹنٹ جنرل ہز اگزالٹیڈ ہائینس آصف جاہ مظفر الملک و الممالک نظام الملک
نظام الدولہ نواب میر عثمان علیخاں بہادر فتح جنگ یار وفادار
سلطنت برطانیہ جی۔ سی۔ یس۔ آئی۔ جی۔ بی۔ ای نظام حیدرآباد (دکن)

میرے معزز و ذی قدر دوست۔

ہز مجسٹی ملک معظم شہنشاہ کشور ہند کی جانب سے مجھے حکم ہوا ہے
کہ درباره معاہده جدید مورخہ ۲۴ ماہ اکٹوبر ۱۹۳۶ء جو برار کے آینده نظم
و نسق سے متعلق ہے میں یور اگزالٹیڈ ہائینس کو اس غرض سے مخاطب
کروں کہ صورت حال واضح اور اس طرح آینده غلط فہمی کا سد باب ہو جائے
ہز مجسٹی نہیں چاہتے کہ معاہدے میں کوئی ایسی چیز درج فرمائیں
جس سے اُس کے اختتام کے امکان غالب کا تصور پیدا ہو سکے
یا بطور اُس کے لازمی نتیجہ کے، ایسے تجاویز شریک فرمائیں جو اُس صورت
میں برار کے ما بعد کے انتظام کے لئے ہوں تاہم، اس غرض سے کہ شبہ
کی گنجائش باقی نہ رہے، ہز مجسٹی اس امر کی صراحت کر دینا مناسب خیال
فرماتے ہیں کہ وہ اس معاہده میں اس صاف و صریح سمجھوتہ پر شریک
ہو رہے ہیں کہ اگر آینده کسی امر کی وجہ سے معاہده کا بدقسمتی سے اختتام
ہو جائے تو ہز مجسٹی کو اختیار ہو گا کہ ایک نئے معاہده کی عدم تکمیل کی صورت
میں یا اُس کے تکمیل پا لینے تک، نظم و نسق برار کے لئے باوجود

کسی امر کے جو عہد نامہ جات بابت ۱۸۵۳ء و ۱۸۶۰ء میں درج ہیں کے برخلاف
ہو ایسے انتظامات جو وہ ضروری تصور فرمائیں قائم کریں۔ اور وہاں
بلا شرکت غیرے کامل اختیارات استعمال فرمائیں لیکن مجھے یہ واضح کر دینے
کا حکم ہوا ہے کہ اس سے نہ تو یور اگزالٹیڈ ہائینس کے برار پر اقتدار اعلیٰ
کا تسلیم کیا جانا۔ نہ سالانہ رقم پچیس لاکھ روپیہ کی ادائی اور نہ کوئی فوجی
کفالتیں جن سے اس وقت یور اگزالٹیڈ ہائینس تحت عہد نامجات موجودہ مستفید
ہو رہے کسی طرح متاثر ہونگی اور نہ ہز مجسٹی یور اگزالٹیڈ ہائینس کی رضامندی
کے بغیر اپنے کو اس کا مجاز تصور فرمائیں گے کہ نظم و نسق برار کے لئے کوئی
انتظامات کسی ایسی بنیاد پر قایم کریں جو اُس بنیاد سے اصولاً مختلف
ہو جو اس وقت قایم ہے۔

یور اگزالٹیڈ ہائینس کی جو اعلیٰ وقعت میرے نزدیک ہے اُس کا
میں اظہار کرنا چاہتا ہوں اور یور اگزالٹیڈ ہائینس کے مخلص دوست کی حیثیت
سے دستخط کرتا ہوں۔

لنلتھگو
وائسرائے و گورنر جنرل ہند

نئی دہلی - مورخہ ۲۶ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء

حالات حاضرہ کو سمجھنے کے لئے معرکہ آرا تصنیف

جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی؟

از جناب شیخ رحمٰن بخش صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

جنگ ہو رہی ہے۔ سب کو معلوم ہے۔ لیکن کیوں ہو رہی ہے۔ شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ معلوم کرنے کے لئے سب مضطرب ہیں۔ آپ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ ہٹلر کے خطرناک ارادے۔ اسکی سازشیں میونچ کا معاہدہ۔ رہائن لینڈ پر جبریہ قبضہ۔ پولینڈ کی تباہی چیکوں کے خلاف انتظامات۔ یوروپ کے اس فتوطلسمی کے ابتدائی مظالم۔ اس کے برسرکار آنے کے اسباب و وجوہ معلوم کریں۔ اگر یہ درست ہے تو آج ہی جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی۔ ملاحظہ فرمایئے۔

نوٹ:۔ آٹھ نقشے بھی شامل کتاب ہیں۔ جس سے واقعات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:۔ عبدالحق اکیڈیمی شاہراہ عثمانی۔ حیدرآباد (دکن)